معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپیے فی شمارہ پانچ روپیے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پندرہ پونڈ یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :۔ حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج ۔ اسٹریچن روڈ ۔ کراچی

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں :

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

- رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

کمیشن ۲۵٪ ہوگا ——— رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۴۹ ماہ رجب المرجب ۱۴۱۲ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۹۲ء عدد ۱

مضامین

ضروری اعلان

ہر قسم کا چیک اور ڈرافٹ صرف دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ کے نام سے آنا چاہیے۔ ایڈیٹر یا اور کسی کے نام سے ہرگز نہ بھیجا جائے۔

— منیجر

معارف اعظم گڈھ

کی

۱۴۹ویں جلد

ماہ جنوری ۱۹۹۲ء تا ماہ جون ۱۹۹۲ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

ہندوستان میں اسلام کو زندہ اور سربلند رکھنے اور مسلمانوں کی شناخت اور تشخص کو باقی اور قائم رکھنے میں دینی درسگاہوں کا خاص حصہ رہا ہے۔ اس لحاظ سے وہ اسلام کے مضبوط و مستحکم قلعے تھیں جن سے حق بین و حق آگاہ افراد پیدا ہوئے اور ان کی آغوشِ تربیت میں ان مردانِ کار کی نشو و نما ہوئی جنھوں نے وقت کے رخ کو موڑ کر اس ملک کی تاریخ و تقدیر بدل دی۔ آزمائشوں میں گھر کر بھی وہ کسی لالچ اور دباؤ میں نہ آئے۔ فقر و احتیاج کے باوجود نہ ان سے صبر و قناعت اور استغنا و بے نیازی کی خو چھوٹی اور نہ ان کے ایمان اور ضمیر پر کوئی آنچ آئی۔ آندھیوں اور طوفانوں کی زد میں بھی ان اصحابِ تسلیم و رضا کے قدموں میں تزلزل نہ آیا۔ اور وہ تختۂ دار پر چڑھ کر بھی صدائے حق بلند کرتے اور اس طرح مرجانے کو حیاتِ جاوداں سمجھتے رہے۔

آج اس ملک میں دین غریب الغربا رہے۔ اور امت پر عجیب وقت پڑا ہے۔ اس نازک صورت حال میں بھی انھی دینی درسگاہوں کے خاکستر میں حق و صداقت کی چنگاریاں باقی رہ گئی ہیں۔ ان میں آئے دن بات بات پر وہ ہنگامہ اور طوفان بدتمیزی نہیں برپا ہوتا جو مادی درسگاہوں کا وتیرہ ہوگیا ہے۔ جن کے طلبہ نے شرافت، اخلاق اور تہذیب و شائستگی سے ہاتھ دھو کر اپنے اساتذہ اور ملک کے عام شہریوں کی ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اور سرکاری املاک اور ملک کے قیمتی اثاثوں کو برباد کرنا ان کا معمول ہوگیا ہے۔ اردو اس ملک کی بیش قیمت متاع اور اس کے فخر و عظمت کی شاندار نشانی ہے جس کو مدت سے دورِ زمان میٹ رہا ہے اور ۱۹۴۷ء کے بعد ہی سے ارباب سیاست کی نظریں اس کی طرف سے پھر گئی ہیں۔ اس تلخ نوائی کو معاف کیا جائے کہ اردو کے خونِ ناحق کی چھینٹوں سے اس کی روٹی کھانے والوں کے

فہرست

مضامین معارف

جلد ۱۴۹

ماہ جنوری ۱۹۹۲ء تا ماہ جون ۱۹۹۲ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

دامن بھی رنگین ہیں۔ اس کی بقا و تحفظ کا سہرا اسلامی مکاتب و مدارس کے رندانِ قدح خوار ہی کے سر ہے۔

لیکن خداوندانِ مکتب سے بھی شکایت ہے کہ اب وہ شاہین بچوں کو خاک بازی کا سبق دے رہے ہیں۔ علم وفن کی وسعت اور مسلمانوں کی ذہنی و دماغی ترقی کے لیے نظر و اجتہاد بنیادی اور اہم چیز ہے جو مفقود ہے۔ اس لیے علم وفن کے سرسبز و شاداب درخت میں پت جھڑ شروع ہو گئی ہے۔ اور اس نے پھولنا پھلنا چھوڑ دیا ہے۔ مسلمانوں کے دل و دماغ پر جمود و تقلید اس طرح مستولی ہو گئی ہے کہ ان سے کسی ایجاد و اختراع کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ پہلے نہ مدارس کی کثرت تھی، نہ ان کی پرشکوہ اور عالی شان عمارتیں تھیں اور نہ ہی آج کل کی طرح مدارس کے پاس بکثرت وسائل و ذرائع تھے، درختوں کے سائے اور چھپروں کے نیچے تعلیم ہوتی تھی۔ لیکن ان ہی بوریا نشینوں نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیے جن سے آج بھی مسلمانوں کا سر فخر سے اونچا ہے۔

گجرات اور جنوب مغرب کے ساحلی علاقوں کو چھوڑ کر بد قسمتی سے ہندوستان میں اسلام اہل عجم کے ذریعہ آیا۔ یہاں ترکوں اور افغانوں کی حکمرانی رہی۔ دینی مدارس اور ان کے نصابِ تعلیم پر فضلائے عجم اور دانشمندانِ ایران کی گہری چھاپ پڑ گئی۔ انھوں نے فقہ حنفی کے علاوہ کسی اور مذہبِ فقہ کا چراغ جلنے نہیں دیا، لوگ منطق و فلسفۂ یونان کی بھول بھلیوں میں پڑ کر قرآن مجید اور احادیث نبویؐ سے دور ہوتے گئے۔ تاہم مولانا شبلیؒ کے بقول "قدرت کو اپنی نیرنگیوں کا تماشا دکھلانا تھا کہ اخیر زمانہ میں جبکہ اسلام کا نفسِ واپسیں تھا، شاہ ولی اللہؒ جیسا شخص پیدا ہوا جس کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی، رازی، ابن رشد کے کارنامے ماند پڑ گئے۔" شاہ صاحب نے قرآن

حدیث کی عام اشاعت کرنی اور تفقہ و اجتہاد کی روح پھونکنی چاہی۔ وہ اب بھی مسلمانوں کے مختلف الخیال طبقوں میں مقبول ضرور ہیں لیکن کوئی ان کی اصلاحِ تعلیم و اجتہاد کی دعوت پر لبیک کہنے کو تیار نہیں ہے۔

ایک افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اب مدارس سے بلند پایہ اور کامل الفن اصحاب نہیں پیدا ہوتے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ مدارس جن عناصر کا مجموعہ ہیں، الّا ماشاء اللہ سب کا مطمحِ نظر تبدیل ہوگیا ہے اور ان کے مقاصد بھی کم و بیش وہی ہوگئے ہیں جو جدید تعلیم گاہوں کے ہیں۔ اسکی وجہ سے بتدریج دونوں کا ماحول اور مزاج بھی تقریباً یکساں ہوتا جا رہا ہے۔ بعض جماعتیں طلبہ کے خام اور ناپختہ ذہنوں کو اپنے مخصوص رنگ میں رنگنا چاہتی ہیں۔ اس کے لیے دینی مدارس کے اندر اور باہر بھی ان کے متعدد پروگرام ہوتے ہیں جن کو فروغ دینے کے لیے خالص سیاسی جماعتوں کی طرح ان کے زیر اثر مدارس میں بھی طلبہ کی یونین اور مختلف تنظیمیں قائم ہوگئی ہیں۔ اس رجحان نے طلبہ کی نگاہ میں مجامع کے مقابلہ میں مدارس کی اہمیت کم کردی ہے اور مطالعہ و کتب بینی کے بجائے ان کی دلچسپیاں ان مشاغل سے بڑھ گئی ہیں، جن میں تعلیمی مراحل ختم کرنے کے بعد ہی ان کو مشغول ہونا چاہیے۔ پڑھنے لکھنے کے علاوہ طالب علموں کی دوسری سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی سے ممکن ہے ان میں کچھ بولنے اور اچھل کود کی عادت پیدا ہوجائے مگر اس سے ان کی استعداد اور تعلیم میں جو کمی اور عدمِ پختگی پیدا ہوگی اس کی تلافی نہیں ہوسکے گی۔

مقالات

رمز الریاحین

از ڈاکٹر نور السعید اختر

۱۰۵۲ھ مطابق ۱۶۴۳ء میں خاندان صفویہ کے شقی القلب بادشاہ، شاہ صفی نے انتقال کیا۔ اس بادشاہ کے جور و ستم سے ایرانی رعایا جان بلب تھی۔ شاہ صفی کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا اور شاہ عباس کبیر کا پوتا، شاہ عباس ثانی کے لقب سے ایران کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ تخت نشینی[1] کے وقت اس کی عمر دس سال تھی۔ اپنی عمر کے سولھویں سال میں شاہ عباس ثانی نے شجاعت اور جوانمردی کے جوہر دکھانے شروع کردیے۔ مغلوں سے قندھار کا قلعہ ۱۰۵۹ھ/۱۶۴۹ء میں دوبارہ چھین لیا۔ شاہ جہاں اپنی پے درپے کوششوں کے باوجود قندھار کو دوبارہ حاصل کرنے میں ناکامیاب رہا۔ شاہ[2] عباس ثانی نے کل ۲۴ چوبیس سال یعنی ۱۰۵۲ھ ۱۶۴۳ء

---

[1] جد و پدر ترا است سال تاریخ + ظل اللہ و ظل حق و ظل معبود (۹۹۴ھ/۱۰۳۸ھ) (۱۰۵۲ھ)

[2] از آثار ایشان عمارات و باغات بہشت آیات بسیار است، خصوصاً سعادت آباد کہ دار السلطنہ اصفہان بنا فرمودہ و سدی و پلی بر رودخانہ بستہ کہ از سد سکندر کمی ندارد و صفتِ عمارات و باغ و دریاچہ کہ در برابر عماراتِ باغِ سعادت آباد تصرف فرمودہ اند...... این بیت تاریخ است۔ دارای جہان پناہ عباس کہ دریاچہ و سد و پل بنا کرد

تذکرۂ طاہر نصرآبادی، ص۱۰۔

تا ۵ ربیع الاول سنہ ۱۰۷۷ھ / ۲۰ اگست سنہ ۱۶۶۶ء تک ایرانی حکومت کی عنان سنبھالی۔

اس زمانے میں آسودگی، فارغ البالی اور بے فکری کا دور دورہ رہا اور بقول ای۔ جی براؤن:

"The more he was beloved by his subjects and The more feared by his neighbours."[1]

لہٰذا ادیبوں اور شاعروں نے شعر و ادب کی طرف توجہ مبذول کی۔ جس کے نتیجہ میں صفوی عہد کی کتابیں زندہ جاوید بن گئیں جن میں:

(۱) تذکرہ تحفۂ سامی، (۲) تذکرۂ ہفت اقلیم از رازی، (۳) تذکرۂ خلاصۃ الاشعار از تقی الدین کاشانی، (۴) فرہنگ رشیدی از عبدالرشید حسینی، (۵) برہان قاطع از محمد حسین برہان، بہار عجم، چراغ ہدایت، تذکرۂ طاہر نصرآبادی، مویدالفضلا، زواری کی تفسیر، فقہی کتابوں میں جامع عباسی، محمد باقر مجلسی کی دینی و مذہبی کتابوں کے علاوہ ملا محسن فیض کاشانی کی شعری کاوش بھی قابل قدر ہے۔

البتہ سیاسی و معاشی اعتبار سے ایران پر بدنظمی اور بحران کے بادل چھانے لگے تھے اسی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر نادر شاہ افشار نے صفوی خاندان کی آخری شمع کو ایک ہی یلغار میں بجھا دیا۔

اس سے قطع نظر صفوی عہد کے پچھتر سالہ دور میں فارسی شعر و ادب کی ترویج و تشویق ہوئی اور بیش بہا ادبی کارناموں کا اضافہ ہوا۔ شاعری کے میدان میں صائب تبریزی ملک الشعراء شاہ عباس ثانی کے مقابل کسی اور کا چراغ جلنا محال تھا۔ تاہم دیگر شعراء نے بھی اپنی اپنی بساط اور لیاقت کے پیش نظر طبع آزمائی کی اور خاطر خواہ اپنی جگہ بنائی۔ شعراء کے اسی زمرے

[1] اے لٹریری ہسٹری آف پرشیا، از ای۔ جی۔ براؤن۔ جلد چہارم ص ۱۱۲۔

میں شیخ محمد میرزا بادی رمزی کا بھی شمار ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ ان کے ادبی کارناموں پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ راقم کو پاکستان کے سفر میں رمزی کے دیوان "رمز الریاحین" کو دیکھنے کا موقع ملا۔ اس کی درخواست پر ڈائرکٹر نیشنل میوزیم کراچی (پاکستان) نے اس نایاب مخطوطے کی زیراکس عنایت کی۔ جس کے لیے راقم صمیم قلب سے ان کا شکرگزار ہے۔

"رمز الریاحین"[1][2] کے مخطوطات

(۱) رمز الریاحین مخزونہ نیشنل میوزیم کراچی۔ (پاکستان)

فہرست انجمن ترقی اردو کراچی مرتبہ سید سرفراز علی رضوی بسلسلہ نمبر ۱۱۶ ص ۳۰۴، کل صفحات ۱۳۰۔ خط نستعلیق، مطلا و مذہب پھولوں کی ۲۷ دیدہ زیب تصاویر۔

[مخطوطات انجمن ترقی اردو کراچی (فارسی و عربی) از سرفراز علی رضوی۔ سنہ تصنیف سنہ ۱۰۷۶ درج کیا گیا ہے۔]

احمد منزوی کی مرتب کردہ فہرست نسخہ ہای خطی (نشریہ شمارہ ۳۸) ص ۲۸۳۸ (نمبر ۲۳ (۳۰) میں تعداد اشعار نہیں دی گئی ہے۔ کراچی کے مخطوطہ میں کل ۱۹۷۹ اشعار ہیں۔

(۲) فہرست نسخہ ہای خطی فارسی از احمد منزوی (نشریہ شمارہ ۳۸) ص ۲۸۳۸ سلسلہ نمبر ۱۲۰۱۳ کتب خانہ ملک ایران نمبر ۳/ ۴۰۹۷۔ خط شکستہ نستعلیق، گیارہویں یا بارہویں

[1] ن۔ ک فرہنگ سخنوران از خیامپور ص ۲۴۳

[2] The secret Language of sweet scented flowers, a description in masnavi Rhyme of the Royal garden of Saadatabad at Isfahan (Iran) by Rieu catalogue of Persian MSS. British Museam Library London Page No 850 (Add-22-789)

صدی کا نوشتہ تعداد اشعار ۲۱۰ (نامکمل)

(۳) بحوالہ فہرست بالا مرتبہ احمد منزوی، نمبر ۳۰۱۲۱ ص ۲۸۳ کتب خانہ مجلس، ایران۔
نمبر ۱۰۱۱، ۱۲۴۴ ہجری کا نوشتہ، دیوان صالح تبریزی سے منسلک ہے تعداد اشعار ۷۵۰۔
(اسکی مائکرو فلم دانشگاہ تہران میں موجود ہے۔ نمبر ۲۸۳۰ (فیلمہا ۱۰۰)

(۴) بحوالہ فہرست نسخہ ہای خطی فارسی، احمد منزوی (نشریہ شمارہ ۳۸) ص ۲۸۳
سلسلہ نمبر ۳۰۱۲۳ کتب خانہ برٹش میوزیم ۲/۲۲۷۸۹ Add.

تاریخ کتابت شعبان ۱۲۵۰ھ/ ۱۸۳۵ء (ورق تارگ ۲۹۳-۲۳۸) ردیف ۸۵۰۰

حالات | رمزی کا پورا نام شیخ محمد میرزا ہادی رمزی تھا۔ ان کے والد ماجد حاجی میرزا حبیب اللہ (عرف عبداللہ) کدخدائی کا پیشہ کرتے تھے۔ رمزی کاشانی الاصل تھے جیسا کہ تذکرۂ منتخب اللطائف کے مولف رحم علی خان ایمان نے تصدیق کی ہے "محمد ہادی رمزی تخلص در اصفہان بود"[1]

ذیل میں رمزی سے متعلق ایک طویل اقتباس درج کیا جاتا ہے جس کی نقل راقم نے اپنے ایران کے سفر کے دوران حاصل کی تھی یہ قصص الخاقان[2]۔ از ولی قلی خان ابن داؤد قلی خان ۱۰۷۳ھ ص ۱۰ کا ہے۔

۱۔ تذکرہ منتخب اللطائف از رحم علی خان ایمان، مرتبہ امیر حسن عابدی ص ۱۹۴ ۲۔ اقتباس منقول از امیر حسن ذاکر زادہ، تہران ایران ۲۸ جون سنہ ۱۹۹۰ء رمزی خلف حاجی عبداللہ کاشانی است ص ۲۲۲ نوٹ [قصص الخاقان مولفہ ولی قلی خان شاملو، یہ کتاب شاہ عباس ثانی کے نام سے منسوب ہے۔ قصص الخاقانی اس کا تاریخی نام ہے۔ اس سے ۱۰۷۳ھ تاریخ برآمد ہوتی ہے۔ اس کا ایک حصہ مکتبہ مجلس اور دوسرا صدر ہاشمی کی ملکیت ہے۔ بحوالہ نسخہ ہای خطی فارسی از عارف نوشاہی ۲: ۱۵۲-]

"از جملہ نقشبندان بہارستان لفظ و نقاشان بدایع نگار عالم معنی کہ رموز دانان عالم اسرار غوامض خیال اند، نورس نہال بوستان والا نشرادی خدام میرزا ہادی رمزی تخلص است کہ از اہتزاز نسیم نطق بہجت شمیمش ریاحین ہمیشہ بہار گلستان مخضر و ریاض فیاض چہار چمن گلشن نثر ہمیشہ منغز است، مرحبا تازہ خیالی کہ بعنایت میرآب سحاب اندیشہ در فضای دل لطافت پیشہ اش ریاحین حقائق معانی چمن چمن شگفتہ و حبذا صاحب کمالی کہ بقوت ہمت بیان در گلشن زبان حق ترجمانش غنچہای شقایق لفظ گل گل شگفتہ از مشاہدۂ کمال گلزار بے خس و خار نسخۂ موسوم "برمزالریاحینش" کہ گونہ گونہ خال و خط مضمون بر روی ہم چیدہ عندلیب حیرت تشکیب نطق سخنوران جہان را خون انفعال تا سقف از گل منقار چکیدہ از خجلت سنبل زلف جبین نثر ا دیلای خطای قلمش کہ ہرگز آفت پریشان رقمی ندیدہ گل نسرین، نسترن قرین بناگوش لالہ عذاری چادر شرم بر سر کشیدہ مشار الیہ خلف میرزا حبیب و نسب آنحضرت بہ اعلم العلماء افضل الفضلا نور چشم جہان مردمی ابن بابویہ قمی منتہی میشود [مولی الیہ] خطہ پاک کاشان دو مثنوی کہ ہر یک ثانی ندارد موسوم برمزالحقائق و رمزالریاحین قریب چہار ہزار بیت از او بہ نظر این ذرۂ احقر رسیدہ، ابیات مدون او کہ سن شریفش از سنی متجاوز از دوازدہ ہزار متجاوز است در فن نقاشی دست تمام دارد۔ قدرتش در چوب تراشی بحدیست کہ از فیض طراوت آب دم سروہای الماس فحل چوب خشک را رتبہ منصب سرسبزی بخشیدہ نموی از گلستان طبعش این چند بیت است۔

غزل

بیاکہ بی تو بدل ہردم از جہاں سنگ است
شیشۂ نازک مزاجِ ماسنگ است

نیافتم کہ پایان درد ماز کجا ست
نبای کوہ کہ دانست تا کجا سنگ است

شکستہ تر شودم دل چو صاف تر گردد
بیاکہ بی تو در آئینہ ام صفا سنگ است

ملایمت کن و در چشم مردمان بنشین
کہ جا بدیدہ کند گر چہ توتیا سنگ است

سوار باش بجادۂ جنونِ رمزیؔ
کہ زیر پا ہمہ جا خار پیش پا سنگ است

این ابیات از جملہ اشعار مصنوعِ مشار الیہ است کہ در دو بحر خواندہ می شود

دو بحرین:-

ای بدل از داغ تو گلزار ہا
در جگر از دوری تو خار ہا

حسن تو در پردہ و کشتہ بیان
جلوہ گر از عکس تو دیدار ہا

مطلعِ مثنویِ موسوم بہ رمز الریاحین اینست

بشنو شکر شکر خداوند
زبان چون مغز بادامست در قند

رباعی:-

عاشق وصلش طلب کند از دل ریش		میل معشوق باشد از عاشق بیش
ہر چند کہ قطرہ را وجود از دریاست		دریا بوجود قطرہ بالد بہ خویش

سفینۂ خوشگو کا مولف رمزی کی رسا طبیعت کی بابت رقمطراز ہے کہ "طبعش قدرت بکمال داشتہ۔ در ہر شعری بمجلس ما۔ از شعر خود دلیل میخواند"[1]

عارف نوشاہی[2] (حالیہ ایران) نے رمزی کاشانی کا سنہ پیدائش ۱۰۴۰ھ/۱۶۳۰ء کے لگ بھگ قرار دیا ہے۔ راقم کے نزدیک عارف نوشاہی کا قیاس جس کی بنیاد مندرجۂ بالا اقتباس پر ہے، بالکل صحیح ہے۔ [فہرست نسخہ ہای خطی فارسی، انجمن، کراچی پاکستان، ۱۹۸۶ء]

طاہر نصر آبادی نے اپنے تذکرے[3] میں اتنی نشاندہی کی ہے کہ رمزی ۱۰۸۳ھ تک اصفہان میں مقیم تھے۔ طاہر نصر آبادی کے اس بیان سے تصدیق ہوتی ہے کہ رمزی نے ۶۰ برس سے زیادہ عمر پائی اور وہ شاہ عباس ثانی کے انتقال کے بعد کم و بیش دس برس[4] زندہ رہے۔

عارف نوشاہی نے تذکرۂ نصر آبادی کے حوالے سے تحریر کیا ہے کہ رمزی شاہی سرپرستی سے قبل اردبیل کے حاکم مرتضیٰ قلی خاں[5] سے وابستہ تھے۔ یہ بھی قرین قیاس ہے کہ

---

[1] سفینۂ خوشگو: ص ۲۲۲ [2] تذکرۂ منتخب اللطائف از رحم علی خاں ایمان ۱۲۲۶ھ، سلسلہ نمبر ۴۳، ص ۱۹۴

[3] تذکرۂ طاہر نصر آبادی، بچاپ تہران ص ۲۷۳ (۱۳۱۷ش)، [4] از عاظم این شاملو است۔ در ایام نواب صاحبقرانی شاہ عباس ثانی قورچی باشی گری سرفراز شدہ۔ بعد از ان معزول شدہ بود تا پادشاہ برسر شفقت آمدہ متولی و وزیر اردبیل شد ہموارہ با موزونان صحبت شعر میدارد و خود متوجہ نظم میشود چنانچہ دیوان فصاحت بنیان ایشان قریب بچہار ہزار بیت است۔ ص ۲۷ تذکرۂ نصر آبادی۔

اصفہان کی خوبصورتی میں اضافہ کرنے میں رمزی جیسے ماہر چوب تراش اور نقاش کا حصہ رہا ہو۔ رمال کی حیثیت سے انھوں نے بے لوث خدمت انجام دی ہو، بہر کیف ایک سلجھے ہوئے شاعر کی حیثیت سے رمزی نے فارسی ادب میں بیش بہا ورثہ یادگار چھوڑا۔ انہیں علم نباتات، طب و حکمت سے بھی اچھا خاصہ لگاؤ رہا ہوگا۔ پھول اور پتیوں کی نباتاتی خصوصیات کو انھوں نے "رمزالریاحین" میں بخوبی آشکار کیا ہے۔ رمزی کی جمالیاتی حس نے پھولوں کے مناظرے کو لطیف سے لطیف تر بنا دیا ہے۔ لہٰذا ایرانی پھولوں کا یہ تمثیلی مناظرہ فارسی ادب کا شاہکار بن گیا ہے۔

تصانیف "رمزالریاحین" کے علاوہ رمزی کی ایک اور مثنوی کا سراغ ملتا ہے۔ اس مثنوی کا نام "رمزالحقائق"[1] ہے۔ اس میں دو ہزار[2] سے زائد اشعار ہیں۔ اس کا ایک حصہ مکتبہ مجلس (ایران) اور دوسرا ابن یوسف (ایران) کی ملکیت ہے۔ تذکرۂ نصرآبادی میں رمزی کی غزلیات کے منتخبہ اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ رمزی کی غزلیات اور دیگر اصناف سخن پر مبنی علاحدہ دیوان یقینی ہے۔

اصفہان نصف جہان "رمزالریاحین" میں رمزی نے اصفہان کی بہت تعریف کی ہے۔ اس کی وجہ سے مورخین ادب کو ان کے اصفہانی ہونے کا شبہ ہوا۔ حالانکہ وہ کاشان کے باشندے تھے اصفہان دراصل رمزی کے فنون لطیفہ کا آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

---

[1] الذریعۃ الی تصانیف الشیعہ : رمزالحقائق (مثنوی رمزی الکاشی المذکور فی (۹: ۳،۴) وہو منتخب "رمزالریاحین" الآتی موجود فی مکتبۃ (المجلس) کما فصلہ ابن یوسف فی فہرسہا (۳ - ۷،۶)۔ نمبر ۵۲۲ او "رمزالریاحین" نمبر ۱۵۲۴ صد ۲۴۹/۱۲ھ فہرست نسخہ ہای خطی از احمد منزوی جلد چہارم صد ۲۸۳۸۔

یہاں فن کی قدردانی اور پذیرائی ہو رہی تھی اور قدرتی خوبصورتی نے اصفہان کو جنت نشان بنا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ رمزی کشاں کشاں اصفہان چلے آئے اور اپنے حاصل کردہ فنون کو مزید جلا بخشی۔

فارسی ادب میں گوناگوں خصوصیات کے باعث اصفہان کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ قم کو روحانیت، شیراز کو سعدی و حافظ کی بدولت فوقیت حاصل ہے۔ چنانچہ حافظ نے شیراز کی تعریف میں کہا ہے۔

بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نخواہی یافت	کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلیٰ را

اسی طرح شعرائے کرام نے اصفہان کی تعریف و توصیف میں مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے چنانچہ ایک ہندوستانی عالم و شاعر ملا فیروز بن کاؤس جلال (۱۷۵۶ء/ ۱۸۳۰ء) نے اپنے "سفرنامہ ایران" میں اصفہان کو ان الفاظ میں سراہا ہے۔

بفضل حق با صفہان رسیدیم	تو گفتی بر زمین جنت بدیدیم
بہر جا باغ و آب جوی جاری	گل و سنبل ہر گوشہ کناری
پر از غلغل ز بلبل باغ و بستان	ہوا خوش ہمچو طبع مے پرستان
خداوند جہان گر اصفہانش	نمیبودی، نمیبودی جہانش
چو آنجا نیست جای علم امکان	تو پنداری مگر خود ہست یونان[1]

مولوی محمد حسین آزاد نے سن ۱۸۸۵ء/۱۸۸۶ء میں ایران کا سفر کیا۔ آزاد نے اصفہان کی ان الفاظ میں مدح سرائی کی ہے

"شہر اصفہان کی وسعت فی الحقیقت بہت فراخ ہے۔ اس نے فارسی مبالغہ کو درست

---

[1] سفرنامہ ایران: از ملا فیروز مملوکہ مہرجی رانا لائبریری، نوساری، صد ۳۹۔

موقع دیا کہ شعرا نے کہا ؎

جہان را اگر اصفہانے نبود — جہان آفرین را جہانے نبود

دوسرے نے کہا ؎

اصفہان نیمہ جہان گفتند — نیمہ وصف اصفہان گفتند

اصفہان کی زندہ رود کے سلسلے میں مبالغہ آرائی ملاحظہ کیجئے۔

اگرچہ زندہ رود آب حیات است — ولے شیراز ما از اصفہان بہ[1]

مولوی محمد حسین آزاد نے اصفہان کے تخت فولاد، مینار جنبان[2]، تالار بزرگ و اس کے دوگوشہ میناروں کو دیکھا اور بے ساختہ کہہ اٹھے "یہ شہر سلاطین صفویہ کی ہمتوں کا عجائب خانہ ہے، عمارات عالیشان کا حال کیا کہوں"۔ "در اصفہان عجائب روزگار است"۔ اصفہان سے آزاد کاشان بھی گئے۔ آزاد کے مطابق اصفہان سے کاشان تک کا فاصلہ صرف آٹھ منزلیں ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اصفہان سے کاشان زیادہ دور نہیں ہے۔ البتہ شاہان صفویہ نے اصفہان کو مرکزیت بخش دی تھی لہذا اس کی ترقی میں چار چاند لگ گئے تھے۔ فنون لطیفہ کے ہر شعبہ میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہو رہی تھی۔ فریڈرک تالبرگ نے شاہان صفوی کی فنون لطیفہ کی سرپرستی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"سلاطین صفوی معماری و ہنرہای زیبا و کارہای دستی را تشویق میکردند۔ بناہای

۱؎ سفرنامہ ایران از مولوی محمد حسین آزاد ص ۲۲ و ص ۱۰۳ (زند زندہ دریائے اصفہان است، سد جائل طولانی از عہد شاہ عباس تعمیر است۔ آزاد) ۲؎ ہلنے والے مینار؛ احمد آباد میں اس کی نقل ہے۔

باشکوہ و عالی و محصولات ہنری بسیار مانند قالی، زری، پیراق، نقاشیہای کتاب و دیوار، کاشیہای معرق، ظروف برنجی، سفال و کوزہ، کاشیہای رنگین، خطوط زیبا توسط خطاطان مشہور، زینت آلات طلا و نقرہ، بشقاب ہا و ظروف میناکاری و سایر قطعات ہنری کہ از این دوران باقی ماندہ از لحاظ زیبائی و ظرافت و ذوق و سلیقہ بہ درجہ است کہ در ہنوز نظیر آنہا پیدا نشدہ است"۔[1]

مندرجہ بالا فنون کی روز افزوں ترقی کے باعث اصفہان دیکھتے ہی دیکھتے عجائب روزگار بن گیا۔ لہذا رمزی نے اصفہان کو اپنا مسکن بنا لیا اور اس کی دل کھول کر تعریف کی۔ رمزی نے اصفہان کے بہشت[2] نما باغ کی تعریف سن رکھی تھی۔ ایک مرتبہ شاہ عباس ثانی نے رمزی کو اصفہان کے باغات کی سیر کو مدعو کیا۔ بادشاہ نے اپنے مخصوص باغ کی توصیف و ستائش کی درخواست کی۔ تاکہ رمزی کا مشاہدہ اور دعوت نظارہ ادبی شہ پارہ اور ادبی تاریخ کا جز بن جائے۔ رمزی نے "باغ ہزار جریب" کی انوکھے پیرایہ میں تعریف کی اور اس شاہی دعوت کو زندہ جاوید بنا دیا۔ انھوں نے پھولوں کے مناظر کو تمثیلی شکل دے کر مثنوی کے قالب میں ڈھال دیا۔ رمزی کا یہ کارنامہ فارسی شاعری میں اختراع کی حیثیت رکھتا ہے۔ شاہ عباس ثانی نے جس وقت باغ سعادت آباد کی بنا ڈالی تو رمزی نے صمیم قلب سے دعائیں دیں۔ وہاں کی ہر شے کو سراپا اصفہان کی صبح و شام، نہر و حوض، مچلتے ہوئے فوارے، بلند و بالا عمارتیں، روشنیں اور ہمہ قسم کے درختوں اور پھولوں کا رمزی نے نہایت چابکدستی

۱؎ از کورش تا پہلوی، از فردریک تالبرگ، چاپ تہران ص ۶ ۲؎ ایرانی تاریخ میں یہ باغ "باغ ہزار جریب" کہلاتا ہے۔

سے محاکمہ کیا۔ حتیٰ کہ خود بادشاہ نے اسے "باغ بہشت نما" قرار دیا۔ رمزی نے اپنے دیوان کا آغاز حمد، نعت، منقبت اور معراج نامہ سے کیا۔ اس کے بعد رمزی نے بادشاہ کی بہشت آئین مجلس کی مدح میں ایک خوبصورت قصیدہ ترتیب دیا اور اس کے عوض میں معقول صلہ حاصل کیا۔ مجلس نشاط و سرور میں کیف و سرمستی لازمی چیز ہے۔ لہٰذا رمزی نے بلبل خوش الحان کی زبانی "عشق و عاشقی کے رموز کی عقدہ کشائی کی" گل و بلبل کے تذکرے کے ساتھ بادہ و ساغر، کیف و انبساط، رنگ اور ترنگ بہار و گلفام کے ذکر سے مثنوی کو قوس قزح بنایا۔ گل و لالہ کی مہک ساغر و مینا کی کھنک اور ساقی گلفام کی مدح سرائی کے بعد دیوان رمزی کے اس حصہ کا آغاز ہوتا ہے جو ادبی نقطۂ نظر سے اور نباتات شناسی کے لحاظ سے نہایت اہم ہے۔

رمزی نے ساقی ہوش ربا اور بلبل خوش نوا کے ہمراہ اصفہان کے بہشت نما باغ میں گلہائے رنگ و بو کی ایک مجلس آراستہ کی۔ ان کی آتشیں زبانوں کو انداز تکلم سے نوازا۔ انہیں نطق و گویائی کے ادب سکھائے۔ جب آتشیں اور بوقلمون زبانیں گویا ہوئیں تو باغ میں ہر طرف سرگوشیاں ہونے لگیں۔ پھر ایک پھول نے اپنی مدح اور مدمقابل کی قدح کے پہلو نکالنے شروع کیے اور مناظرۂ گل با گل دیگر طول کھینچتا چلا گیا۔ مے ارغوانی کے خم کے خم چھلکے تو ساقی نامہ مرتب ہوا۔ الغرض رمزی کا یہ تمثیلی مناظرہ اور باغ جنان کا منظوم محاسبہ فارسی شعر و ادب کا ایک شاہکار بن گیا۔ تمثیل نگاری فارسی ادب کی قدیم روایت رہی ہے۔ فتاحی نیشاپوری نے "قصہ حسن و دل[1]" کے ساتھ اس کا آغاز کیا تھا۔ لہٰذا یہ سلسلہ جاری رہا اور رمزی نے بھی اسی تمثیلی انداز کو اپنایا اور ایک اچھوتے

---

[1] قصہ حسن و دل، مضمون از راقم، شیرازہ کشمیر ۱۹۷۵ء جلد ہشتم۔

ڈھنگ سے بے زبان پھولوں سے ہر وہ بات کہلوائی جو اس کے رنگ اور روپ میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ آج تک ہر شخص نے پھولوں کی خصوصیات و رموز کو محسوس ضرور کیا لیکن ان کی خوبی و زشت کو رمزی نے شعری جامہ پہنا کر پیش کیا۔ رمزی کی یہ تحقیق و تجسس ایک کارنامے سے کم نہیں ہے۔ لہٰذا رمزی ہماری داد و ستد کے حد درجہ مستحق قرار دیے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ طاہر نصرآبادی شیخ رمزی کی شخصیت و شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:۔

"طبعش نہایت قدرت دارد، چنانچہ ہیچ لطیفہ و مثل در عالم نیست کہ او موزون نکردہ باشد، چراکہ ہیچ مثلی مذکور نمی شود کہ از شعر خود دلیلی نمیخواند۔ در فن نقاشی و چوب تراشی ہم مانند ندارد[1]"

مخطوطے کا اجمالی تعارف

رمز الریاحین۔ مملوکہ نیشنل میوزیم، کراچی۔ فہرست مخطوطات فارسی، از رضوی۔ صفحات، ۱۳۸۔ سائز "۶ × ۱۰½" خوبصورت اور نفیس شیرازہ بندی ۲۸ ایرانی پھولوں اور ۲ زیبا پرندوں کی نہایت دیدہ زیب تصویریں۔ سطر فی صفحہ ۱۸ کاغذ زرپاشی، مطلا مذہب۔ ترقیمہ، ندارد اس کے موضوعات حسب ذیل ہیں۔

دیوان رمزی کی ابتدا او حمد و مناجات سے ہوتی ہے۔

الف۱۔ لیشہد شکر خدا و ند — زبان چون مغز بادامست در قند

الہی خاطر اندوہ گین دہ — رخ زرد و سرشک آتشین دہ

الف۲ (کل چہار مناجات)

۲۔ اس کے بعد معراج نامہ ہے جس میں ساتوں آسمانوں کی سیر پیش کی گئی ہے۔

---

[1] تذکرہ نصرآبادی: طاہر نصرآبادی ص ۳۰۲

نعت رسولؐ :-

محمدؐ آبروی آفرینش　　چراغ افروز در چشم اہل بینش

معراج نامہ :-

شبی مجموعۂ فیض الٰہی　　منور گشتہ از مہ تا بماہی

۳- اس کے بعد نعتیہ غزل ہے۔

ازین خوشتر بگو رمزی دمادم　　کزو یابی مراد ہر دو عالم

۴- مختصر نعت کے بعد منقبت ہے جس میں حضرت علیؑ کی مدح ہے۔

در نعت رسولؐ :-

کرا در خور بود زینگونہ پیوند　　کہ داماد ش بود شیر خداوند

۵- شاہ عباس ثانی (۱۰۵۲ھ تا ۱۰۷۷ھ) کے عدل و احسان سے متعلق قصیدہ۔

برو در اینچنیں شاہ جوان بخت　　کہ بر خوردار باد از تاج و از تخت

۶- اصفہان کی شان و شوکت پر ایک نظم۔

کہ باغی در کنار اصفہان است　　کہ عیش افزا تر از باغ جنان است

۷- سبب نظم کتاب۔

بیا با صدق دل تا حضرت شاہ　　کہ بینی مدعای خویش دلخواہ

بخوان در مدح شہ نظمی کہ داری　　کہ دامن پر گل مقصد بیاری

اس کے ساتھ ساتھ ..

۸- صبح اصفہان کی تعریف و سبب نظم کتاب :-

یکی روشن صباحی بود خرم　　از و بیدار چشم عیش عالم

خجستہ پیکی از مہدی[۱] قلی خاں　　رسیدہ این مژدہ داد از لطف و احسان

۹- زایندہ رود اصفہان کی تعریف :-

نہادہ زندہ رودش جبہہ بر در　　ز خاکش آب رو بگرفتہ گوہر

۱۰- در تعریف سعدی :-

---

[۱] شاہ عباس ثانی کے وزیر کل کا اسم گرامی۔ نواب مہدی قلی خاں نے رمزی کو مدحیہ نظم پڑھنے کی دعوت دی تھی۔ رمزی نے اس دعوت کی طرف مندرجہ ذیل اشعار میں واضح اشارہ کیا ہے۔

کہ شاہ امروز در باغست چون گل　　رسد بر گوشۂ چرخ افغان بلبل

بیا با صدق دل تا حضرت شاہ　　کہ بینی مدعائے خویش دلخواہ

شرف شو بیا بوس شہ امروز　　کہ ہست این عید قربان تو نوروز

بخوان در مدح شہ نظمی کہ داری　　کہ دامن پر گل مقصد بیاری

برنگ غنچہ من زین مژدہ خندید　　چو گل از خرمی بر خویش بالید

بخود گفتا کہ ای بیدار برخیز　　گل مطلب بجیب مدعا ریز

مخطوطہ رمزالریاحین ص۲۳، تذکرۂ نصرآبادی تالیف میرزا محمد طاہر نصرآبادی میں مولانا محمد امین الوقاری الیزدی کی تحریر کردہ وہ تاریخ ملتی ہے جو انھوں نے نواب میرزا مہدی (قلی خاں) صدر کی وزارت کے موقع پر منظوم کی تھی۔

چو آن دیدم در فیض ازل را حلقہ کوبیدم

دو تاریخ از دو مصراعم کشود آدم بنظم آن نیک

وزیر کل ایران زیب ملکی صدر دین مہدی

زہی کامل زہی دستور ادام اللہ اقبالک

تذکرۂ نصرآبادی ص۴۸ ب

بہ پیشش سدی از خارا کشیدہ چنان سدی کہ اسکندر ندیدہ

۱۱۔ در تعریف باغ سعادت آباد (اصفہان)

درین روی عیان از چوب شمشاد چو حرف مرد دانشمند آزاد

۱۲۔ در تعریف اشجار و ریاحین و چنار۔

۱۳۔ اس کے بعد مختصر سی دعا ہے اور ساتھ ہی اصفہان کی پرشکوہ عمارات کا ذکر۔

۱۴۔ در دعائے دولت شاہ عالم پناہ۔

الہی تا بود گلزار عالم بود گلزار طبع شاہ خرم

۱۵۔ در تعریف میمنت اساس سعادت آباد۔

بچشم بکندی تماشا ساده بہبود بناگہ مصر این گلزار بہبود

۱۶۔ در تعریف حوض و فوارہ و نہر۔

بہر سو پیش نمایان حوض آبی گل آن باغ و بستان را گلابی

اس کے بعد رمزی کی شاہی مجلس میں شرکت کا بیان ہے۔

۱۷۔ رفتن بمجلس "بہشت آئین" و مدح خواندن و صلہ گرفتن۔

چو خواندم مدح شہ را تا بپایان شہ عالی کرم از لطف و احسان

بہر یک بیت یک تومان عطا کرد ہمہ کارم بعین مدعا کرد

بعد ازاں عشق و عاشقی کا بیان ہے اور بلبل کی زبانی رموز عشق کی پردہ کشائی کی گئی ہے۔

۱۸۔ غزل در تعریف عشق از زبان بلبل۔

بیا ای شیخ در کاشانۂ عشق بہ بین روح القدس پروانۂ عشق

چون از بلبل مر این ابیات رمزی شنیدم جملہ از افسانۂ عشق

۱۹۔ در صفت و شور و سودای عشق:۔

خرد را محرم اسرار کردم زبان را طوطی گفتار کردم
در گنج سخن را باز کردم زہجران این غزل آغاز کردم

۲۰۔ غزل از رمزی۔

مطلع۔ بیا ای شاہباز کبک رفتار گذاری کن بسوی این گرفتار

مقطع بیا جانا کہ رمزی را شگفتہ گل آشفتگی بر طرف دستار

۲۱۔ قطعۂ نصیحت آمیز از زبان بلبل:۔

نظر از غیر جانان بایدت دوخت نظر بازی ز نرگس بایدآموخت

کہ ہرگز غیر یارش در نظر نیست زگلزار زگلچینش خبر نیست

۲۲۔ مثل:۔

بچشم دل توان آن یار دیدن فروغ شعلۂ دیدار دیدن

۲۳۔ قطعۂ از زبان بلبل در تعریف بہار و مے:۔

با فغان بلبلان در باغ و بستان چرا خاموش بنشیند سخندان

اس کے بعد رمزی نے "ساقی نامہ" منظوم کیا ہے۔ جس کے مندرجہ ذیل عنوانات ہیں۔

۲۴۔ (۱) در تعریف ساقی۔

دمی کردن بیار زندگانی بود خوشتر ز عمر جاودانی

(۲) خطاب بساقی قم:۔

بود ہر قطرہ زان مے بحر نوری رسد بر دل از ان ہر دم شعوری

(۳) خطاب بخویش :-

بیای دل رہِ افتادگی گیر گلابی از گل آزادگی گیر

(۴) خطاب بساقی و قسم نامہ :-

بفریاد و فغان داد خواہان بعدل بادشاہ بادشاہان

(۵) در تعریف مے :-

شرابی دہ کہ چون رخ پر بیروزد تجلی وادیِ ایمن بسوزد

ساقی نامہ کے اختتام پر رمزی نے نہایت دلکش موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ انھوں نے ساقی سے مخاطب ہو کر نوبہار کی جلوہ طرازیوں اور ریاحین خوش رنگ کا مناظرہ پیش کیا ہے۔ اس نظم میں کل اٹھائیس ۲۸ مہکتے اور لہلہاتے ہوئے پھولوں کا ذکر ہے۔ جو مجلس عیش و طرب میں اپنی اپنی خوبیوں کو پیش کرتے ہیں اور مد مقابل پھول اس کی مذمت کرتے ہوئے اپنی خصوصیات عیاں کرتا ہے۔ رمزی نے اسی مناسبت سے اپنے دیوان کا نام "رمزالریاحین" منتخب کیا ہے۔ مذکورہ اٹھائیس ۲۸ پھولوں کا سلسلہ وار ذکر مندرجہ ذیل ترتیب کے مطابق ہے۔

انگریزی مترادفات	نمبر	فارسی			اردو مترادفات
Narcissus. French Daffodil	۱	گفتگوی نرگس در	تعریف	حسن و جمال خویش	
violet/Pansy. vioacede	۲	" بنفشہ "	مذمت	نرگس	
		" "	تعریف	رنگ و بوی خویش	
	۳	" بید مشک "	مذمت	بنفشہ	مشک بید
Hyacinth, nard	۴	" سنبل "	مذمت	بید مشک	سنابل

انگریزی مترادفات	نمبر	فارسی			اردو مترادفات
		گفتگوی سنبل در	تعریف	رنگ و بوی خویش	
Ambergris, Jonquil	۵	" عنبر بو "	مذمت	سنبل	
		" عنبر بو "	تعریف	رنگ و بوی خویش	
Cornpoppy-Adonis-Anemone	۶	" شقائق "	"	آب و رنگ خویش	گل لالہ
Delphinium. larkspur	۷	" گل زبان در قفا	مذمت	شقائق	
		" " "	تعریف	آب و رنگ خویش	
wallflower, Garden-Rocket Damis violet	۸	" شب بو در	مذمت	گل زبان با قفا	رات رانی
		" " "	تعریف	رنگ و بوی خویش	
lilly of thi vally, liliaceous	۹	" " سوسن "	مذمت	شب بو	
		(آسمانی رنگ کا پھول جسے شعرا زبان سے تشبیہ دیتے ہیں) گفتگوی سوسن در	تعریف	آب و رنگ خویش	
Tulip. Anemone	۱۰	" لالہ سہند "	مذمت	سوسن	لالۂ نعمان
		" لالہ "	تعریف	آب و رنگ خویش	
Dehicent Opening-of thi capsul of the plants)	۱۱	" شگوفہ "	مذمت	لالہ	
		" شگوفہ "	تعریف	حسن و جمال خویش	
Dark Blue Jasmine	۱۲	" یاسمین کبود "	مذمت	شگوفہ	
		" " "	تعریف	خویش	
Love tree siliquastrum	۱۳	گفتگوی ارغوان در	مذمت	یاسمین کبود	

انگریزی مترادفات	نمبر	فارسی			اردو
		گفتگوی ارغوان در	تعریف	حسن وجمال خویش	
white lily	۱۴	،، زنبقِ سفید ،،	مذمت	ارغوان سرخ	
		،، ،، ،،	تعریف	رنگ وبوی خویش	
	۱۵	،، گل عاشق ومعشوق ،،	مذمت	زنبق سفید	
		،، ،، ،،	تعریف	حسن خویش	
Amaranth cockscomb.	۱۶	،، زلف عروس ،،	مذمت	گل عاشق ومعشوق	تاج خروس/زلف عروساں
		،، عروساں ،،	تعریف	آب ورنگ خویش	
Hemerocallis. Daylily	۱۷	،، زنبق زرد ،،	مذمت	زلف عروس	چنبیلی کی قسم
		،، ،،	تعریف	خویش	
	۱۸	،، گل مشکچه	مذمت	زنبق زرد	
		،، ،،	تعریف	آب ورنگ خویش	
clove gilli flower. caryophyllaceous	۱۹	،، قرنفل ،،	مذمت	گل مشکچه	
		،، ،،	تعریف	آب ورنگ خویش	
white Jesmine	۲۰	،، یاس سفید ،،	مذمت	قرنفل	یاسمن
		،، ،، ،،	تعریف	حسن خویش	
	۲۱	،، گل عباس ،،	مذمت	یاس سفید (یاسمن سفید)	
		،، ،،	تعریف	آب ورنگ خویش	
Sweet Basil	۲۲	،، ریحان ،،	مذمت	گل عباس	

انگریزی مترادفات	نمبر	فارسی			اردو
		گفتگوی ریحان در	تعریف	آب ورنگ خویش	
Parsely, French-Merigold.	۲۳	،، گل جعفری ،،	مذمت	ریحان	
		،، ،،	تعریف	آب ورنگ خویش	
sweet brier-Eglantine	۲۴	،، نسترن ،،	مذمت	گل جعفری	جنگلی گلاب سیوتی
Marshay Hollyhock Rose-mallow	۲۵	،، خطمی ،،	مذمت	گل نسترن	گل خیرو [نیلے رنگ کا پھول جو بطور دوا استعمال ہوتا ہے]
		،، ،،	تعریف	آب ورنگ خویش	
Yellow ochre	۲۶	،، گل زرد ،،	مذمت	گل خطمی	
		،، ،،	تعریف	رنگ وبوی خویش	
china Aster	۲۷	،، گل رعنا ،،	مذمت	گل زرد	گل مینا
		،، ،،	تعریف	رنگ وبوی خویش	
Rosebush Rosaceous	۲۸	،، گل سرخ ،،	مذمت	گل رعنا	سدا گلاب، گل پیادہ
		گفتگوی گل سرخ در	تعریف	خود ورنگ وبوی خویش	
		تمثیل (غزل از زبان بلبل)	تعریف	گل سرخ	

. . . .

اس کے بعد بادشاہِ زمانہ سلطان حسین صفوی موسوی بہادر خاں کی مدح میں قصیدہ ہے۔ خطاب اور اختتامیہ اشعار میں کلیات کے نام کی صراحت کی گئی ہے۔ ؎

نہادم نام او را "رمز الریاحین" — کہ در وی ہست گوہرہای ناسفتہ

کلیات میں اصنافِ سخن کی تعداد:۔

(۱) قصاید (۴) (۲) غزلیں (۳) (۳) قطعات (۲) (۴) تمثیل (۴) (۵) مثنوی (۱) طویل مثنوی۔ دربارۂ مناظرۂ گلہا۔ (۶) رباعیات (۴) = کل ۱۸۔

رمزی کے بکھرے ہوئے اشعار | (۷) حمد، مناجات، نعت، منقبت، معراج نامہ، ساقی نامہ۔

اشعار رمزی ماخوذ از تذکرۂ نصرآبادی (تالیف میرزا محمد طاہر نصرآبادی: باتصحیح و مقابلہ از وحید دستگیری ۱۹۵۳ء، کتابفروشی فروغی۔ ایران)

رباعیات:۔ ۱۔ رمزی ز کریم اگر خبردار شوی — از بہر عطای او گنہگار شوی
جز اینکہ کنی گناہ و احسان خواہی — مستوجب رحمت بچہ کردار شوی[1]

(۲) آنم کہ نہ حاصلی نہ کشتی دارم — نہ کار بکار خوب و زشتی دارم
از من ہمہ می رمند یاران وطن — در دوزخم و طرفہ بہشتی دارم

(۳) ہمدم بنود بکنج این دیر مرا — در گلشن بیکسی بود سیر مرا
ہمچون الفم براستی پا برجا — نبود حرکت بخانۂ غیر مرا

(۴) ای مونس و غمگسار دیرینۂ من — بی یاد تو دل مباد در سینۂ من

---

[1] ریحانۃ الادب: تالیف استاد علامہ میرزا محمد علی مدرس، جلد دوم ص۱۳۳۔ ص۳۳۲ در تذکرہ گوید "درکمال پریشانی طبعی توانا داشت؛ چنانچہ ہر لطیفہ و مثلی را کہ بنظرش میرسید آنرا موزون می کرد و مثلی را کہ مذکور می شد از شعر خود استشہاد می نمود" مدرس۔

گر پرتوی از لطف تو بر من تابد — زربفت شود لباس پشمینۂ من[1]

اشعار منتخبہ از غزلیات رمزی:۔

۱۔ عارف میان خلق ہمان با خدا بود — در معدنست لعل و ز خارا جدا بود[2]
۲۔ بترس از ناوک آہ فقیران در دل شبہا — مگو تیر ہوائی بر نشان ہرگز نمی آید
۳۔ وحشی نگہان عاشق غمخوار نخواہند — در گلہ آہو بنود راہ شبان را[3]
۴۔ زبردستی را کجا باک از زیردستی بود — ہر کہ باشد در بلندی ہمیشش از پستی بود[4]
۵۔ گوشۂ ابرو چو پیشش از وعدہ بنمای اداست[5] — گر ہلال عیدی کم یک نماید خوشنما است
۶۔ بکاہد دل چو نقش دولت روشندلی بینم — چنان کز کاہش مہ مغز باد در استخوان کاہ[6]

تاریخ سد زایندہ رود در اصفہان:۔

۱۔ مصمم بود شہ را عزم حبسای — چو بشنید این سخن را منحرف شد
نادر با نجبان آمد ببغداد — عنانش زان عزیمت منعطف شد
خبر شد حافظ احمد را از این عزم — سرش در فکر ہمدوش کتف شد
بجد شد در فرار خویش و برگشت — تو گفتی آفتابش منکشف شد
چو رفت این قسم تاریخش نوشتم — بحیص و بیص احمد منصرف شد[7]

۲۔ جند اسدی کہ از خدا بد پیش زندہ رود — از عطای شاہ دین عباس ثانی بستہ اند
بہر تاریخش گذشت از آب رمزی نوشت — سد سکندر بآب زندگانی بستہ اند[8]

---

[1] رباعی تا ۴ + تذکرہ نصرآبادی ص۳۰۳ و ابن یوسف (کتابخانہ مجلس تہران ۔ ۲۰۱-۲۰۰)، [2] قاموس الاعلام ازش سامی (ترکی) ص۲۲۹۹ سنہ ۱۳۱۶ھ [3] زنوزی (ر) روضۂ پنجم قسم دوم ص۳۳۲ [4] آذر ص۲۲۰ [5] روا[illegible]، در منتخب اللطائف مولفہ رحم علی خاں ایمان ۱۰۳۵ھ سلسلہ نمبر ۳،۶ (مولف نے صرف ایک شعر نقل کیا ہے) [6] تذکرہ نصرآبادی ص۳۰۳ [7] ایضاً ص۲۸۱ [8] ایضاً ص۳۰۲ (از آثار ملی اصفہان، از ابوالقاسم رفیعی، تہران)

کچھواہہ راجہ بھگونت داس والیٔ انبیر

از

جناب عبدالرؤف خاں ایم۔اے۔

آمیر (جے پور) کے ابتدائی کچھواہہ[۱] راجگان معمولی حیثیت کے زمیندار تھے جن کی تاریخ بجائے تاریخی حقائق و شواہد کے محض تخمین و ظن اور قیاس آرائی پر مبنی ہے لیکن راجہ پرتھوی راج کچھواہہ (۱۵۰۳ء - ۱۵۲۷ء) کے عہد سے آمیر کے راجاؤں کو قدرے اہمیت حاصل ہونا شروع ہو گئی تھی۔ پرتھوی راج خانوادہ کنواہہ یا کانوہ کی جنگ ۱۵۲۷ء میں رانا سانگا کے ہمراہ داد شجاعت دیتا ہوا بری طرح زخمی ہوا اور زخموں کی تاب نہ لا کر ۱۵۲۷ء میں ہی فوت ہو گیا۔ چنانچہ جے پور کے راجگان اسے ہی اپنا مورث اعلیٰ تسلیم کرتے ہوئے اپنے شجرہ کی ابتدا اسی سے کرتے ہیں، چندر محل اور البرٹ ہال (میوزیم) جے پور کی دیواروں پر جو تصویریں بنوائی گئی ہیں، ان میں

[۱] ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ کچھواہہ رام چندر جی کے بڑے بیٹے کُش کی نسل سے ہیں اس کے برعکس کچھ مورخ اس لفظ کو "کچھپ (سنگ پشت بر گھٹ (جسم) کی بگڑی ہوئی شکل تسلیم کرتے ہیں جس سے عام بول چال میں کچھواہہ بنا۔ کُش کی نسل ہونے سے بھی "کُشواہہ" کہلائے اور یہی کشواہہ عوامی لہجہ میں کچھواہہ ہو گیا۔ (ملاحظہ ہو "راجستھان کا اتہاس" ص ۱۰۵-۱۰۴، از گوپی ناتھ شرما مطبوعہ ۱۹۷۸ء۔

پہلی تصویر اسی پرتھوی راج کی ہے۔ کیونکہ اس خانوادہ میں یہی ایسا پہلا راجہ تھا جسکی حکومت وسعت رقبہ اور کسی حد تک سیاسی اہمیت کے پیش نظر مستحکم ہو گئی تھی۔ راجہ پرتھوی راج کے نو[۹] رانیاں تھیں جن میں بیکانیر کے راؤ لون کرن کی راجکماری بالاں بائی کے بطن سے بارہ[۱۲] اولاد ذکور اور سات دیگر رانیوں سے تھے، اس طرح اس کے کل انیس[۱۹] راجکمار تھے[۱]۔ ان میں سے پورن مل، بھیم سی (بھیم دیو) اور بھارمل آمیر کے راجہ ہوئے۔ پرتھوی راج کے انتقال (۱۵۲۷ء) کے بعد پورن مل آمیر کی گدی پر بیٹھا، اس دوران میں مغل حکومت نسبتاً مستحکم و پائیدار ہو گئی تھی۔ اس وجہ سے پورن مل نے مغلوں سے روابط قائم کرنا چاہے اور وہ پہلا راجپوت زمیندار تھا جو مغل شہنشاہ ہمایوں کے دربار میں حاضر ہوا اور "راجہ" کے خطاب نیز ماہی مراتب[۲] کا اعزازی نشان

[۱] دیکھیے موہتا نینسی ری کھیات، راجستھانی بھاکا میں بہت سے بادفروش (بادخواں) لوگوں کے ذریعہ مختلف کھیات" (شہرت نامے) لکھی گئیں ان میں موہتا نینسی کی کھیات بہت مشہور ہے جو تاریخی ماخذ کے علاوہ ادبی اہمیت کی حامل بھی ہے، برائے تفصیل ملاحظہ ہو حوالہ سابق ص ۴۳ تا ۴۴

[۲] ماہی مراتب کی وضاحت میں ہنومان شرما رقمطراز ہے کہ ایک دفعہ ایران کے بادشاہ نوشیرواں کا نبیرہ خسرو تخت سے دستبردار کر دیا گیا تھا، فوجی طاقت حاصل کر کے وہ دوبارہ تخت نشین ہوا اُسدن ماہ برج حوت میں تھا جسے خسرو نے فال نیک سمجھ کر ماہی اور چاند کے ملے ہوئے نشان کو "ماہی مراتب" کے نام سے مشہور کیا۔ خسرو نے اس نشان کے نقرہ و طلا سے علم بنوا کر اپنے امراء کو اعزازی طور پر دیے۔ بعد ازاں شاہان مغل نے بھی اسکی پیروی میں اپنے جاں نثار امراء کو ماہی مراتب سے نوازنے کی ابتدا کی۔ "صاحب فرہنگ آصفیہ لکھتے ہیں کہ ماہی مراتب وہ اعزازی نشان کہلاتے تھے جو بادشاہوں کی سواری کے آگے آگے ہاتھیوں پر چلتے تھے۔ اصل میں یہ سات شکلیں باعتبار سیارات بہ تفصیل ذیل ہوا کرتی تھیں۔ ہیکل[۱] آفتاب یعنی سورج کا نشان، نشان[۲] پنجہ، نشان[۳] میزان، اژدہا[۴] بیکو سورج[۵] مکھی، مچھلی[۶] اور گولہ[۷] یعنی کرد" (دیکھو لفظ ماہی مراتب کے تحت)

سے نوازا گیا۔ لیکن پورن مل کو ۱۵۳۳ء میں بھیم دیو شکست دے کر آمیر کا وارث بن گیا اور ۱۵۳۶ء میں اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا رتن سنگھ تخت نشین ہوا جسے اس کے چھوٹے بھائی آسکرن نے زہر دے کر مروا دیا اور خود حکمراں بن بیٹھا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد بھارمل نے سرداروں کو اپنا طرفدار بنا کر آسکرن کو ذلت آمیز طریقہ سے گدی سے دست بردار کر دیا اور جون ۱۵۴۷ء (سمبت ۱۶۰۴) میں خود آمیر کا حکمراں بن گیا۔ آسکرن بادشاہ وقت اسلام شاہ سور (۱۵۴۵ء۔۱۵۵۳ء) کی خدمت میں بغرض داد خواہی حاضر ہوا لیکن بھارمل نے بھی گوپال ناتھاوت کو اپنا سفیر بنا کر اسلام شاہ سور کے دربار میں روانہ کر دیا۔ اسلام شاہ نے بجائے آمیر کے "نروز" کا ٹھکانہ آسکرن کو دے دیا جہاں ۱۶۹۶ء تک اس کی نسل جاگیر پر قابض رہی۔ پرتھوی راج کے انتقال (۱۵۲۷ء) اور بھارمل کی تخت نشینی (۱۵۴۷ء) تک آمیر میں اس بیس سالہ مدت کے دوران انتشار، خلفشار اور سازشوں کا دورہ دورہ رہا۔

۱۵۵۶ء میں اکبر کے تخت نشین ہونے کے بعد بھارمل نے دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے حاجی خاں پٹھان کے خلاف نارنول کے مغل حاکم مجنوں خاں قاقشال کی مدد کی جس کے صلہ میں اسے اکبر نے دربار میں بلوا کر خلعت فاخرہ، اسلحہ اور زیورات مرصع سے نوازا اور ۱۵۶۲ء میں اپنی راجکماری ہیرا کنور[1] کی شادی اکبر سے کرنے کے بعد وہ مغل سلطنت کا

[1] استاذ محترم آنجہانی ڈاکٹر متھرالال شرما اس راجکماری کا نام "ہیرا کنور" بتلاتے ہیں (ہسٹری آف جے پور) لیکن ڈاکٹر گوپی ناتھ شرما لکھتے ہیں کہ شاید راجکماری کا پہلے کا نام مان متی تھا جسے "شاہی بائی" بھی کہتے تھے جیسا کہ بیکانیر अभिलेखागार کے ایک شجرہ سے معلوم ہوتا ہے (راجستھان کا اتہاس ص ۳۵۵ ح ۳۵) اکبر نے اسے مریم الزمانی کا خطاب عطا کیا۔ شہزادہ سلیم (بقیہ حاشیہ ص ۳۱ پر)

امیر الامرا اور پانچ ہزاری ذات و سوار کا منصبدار بنا دیا گیا۔ یہ شادی مغل راجپوت اتحاد میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ بھارمل کی وفات ۱۵۷۳ء میں فتح پور سیکری یا آگرہ میں ہوئی[1]۔ لیکن کرشن دت باجپئی نے اپنی تصنیف "برج کا اتہاس" جلد دوم میں لکھا ہے کہ بھارمل نے اپنے آخری ایام متھرا میں بسر کیے جہاں وشرام گھاٹ پر جنوری ۱۵۷۴ء میں اس کا انتقال ہوا اور اس کی نعش کے ساتھ اس کی رانی بدنادیوی بھی "ستی" ہوئی جس کی یادگار کے طور پر ۱۵۷۰ء میں جمنا کے کنارے راجہ بھگونت داس نے پچپن (۵۵) فٹ اونچا "ستی برج" تعمیر کروایا۔ اس (بدنادیوی) رانی کے بطن سے بھارمل کے دو لڑکے پیدا ہوئے۔ پہلا بھگونت داس اور دوسرا بھگوان داس۔ نام کی اسی مماثلت کے سبب راجستھان کے مشہور مورخ ڈاکٹر گوری شنکر ہیرا چند اوجھا کو بھی تذبذب کا سامنا کرنا پڑا چنانچہ وہ رقمطراز ہیں کہ مان سنگھ بھگونت داس کا دوسرا (چھوٹا) راجکمار تھا جسے آمیر کے راجہ "بھگوان داس" نے اپنا متبنیٰ بنایا تھا[2]۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر اوجھا کے خلجان میں مبتلا ہونے کی وجہ غالباً یہ ہے اکثر عصری فارسی کتب تاریخ میں بھگونت داس کی بجائے

(بقیہ حاشیہ ص ۳۰) اسی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ عوام الناس میں بالعموم یہ جودھا بائی کے نام سے مشہور ہے۔ جبکہ جودھا بائی (جگت گوسائیں) جہانگیر کی ملکہ تھی جس سے ۱۵۸۶ء میں شادی ہوئی، یہ راجکماری جودھپور کے موٹا راجہ اودے سنگھ کی لڑکی تھی (دیکھیے ہسٹری آف جہانگیر از ڈاکٹر بینی پرساد ص ۶۔۲۵ مطبوعہ ۱۹۴۰ء راجستھان کا اتہاس از گوپی ناتھ شرما ص ۱۔۔۔۴۳، امرائے ہنود وغیرہ) دراصل سلیم کی اس بیگم کو جودھپور کی راجکماری ہونے کے سبب جودھا بائی بھی کہا جاتا تھا (شرما ص ۴۳۱)

[1] بانکی داس ری کھیات (نروتم داس) نمبر ۱۴۱۳، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷ ص ۱۲۴

[2] راجپوتانہ کا اتہاس ۳: ۳۸، نیز مقالہ "کچھواہوں کے اتہاس میں ایک الجھن" مشمولہ مادھری بابت اساڑھ سمبت ۱۹۸۳/۱۹۲۶ء۔

"بھگوان داس ہی لکھا ہوا ملتا ہے[1] مگر علامی ابوالفضل اکبرنامہ میں بھگونت داس ہی لکھتا ہے[2]
اور بھارمل کے انتقال کے بعد یہی بھگونت داس ماگھ سدی ۶ سمبت ۱۶۳۰ معادل ۲ فروری
۱۵۷۳ء کو آمیر کا راجہ ہوا۔ منشی دیوی پرساد اپنی تصنیف "آمیر کے راجہ" میں رقمطراز ہیں کہ
بھگونت داس کے ٹیکے (وہ قشقہ جو کسی راجہ کی پیشانی پر اس کی تخت نشینی کے وقت
لگایا جاتا ہے جسے راج تلک بھی کہتے ہیں) کا دستور فتحپور سکری میں خود شہنشاہ اکبر نے
کیا اور پانچ ہزاری منصب عطا کرتے ہوئے امیر الامراء کا درجہ بھی تفویض کیا گیا اور
اسی وقت بھگوان داس کو قصبہ لوان (ناہن) کی جاگیر بخشی۔ اس قصبہ کو جو جے پور و دوسہ
کے درمیان کوہستانی سلسلہ کے درمیان واقع ہے، بھارمل نے ہی مینا (मीणा)
اقتدار ختم کر کے از سر نو آباد کیا تھا۔

آمیر کے کلیان جی کے مندر کے دروازہ کے کتبہ[3] کی عبارت نیز دیگر کتبات اور
راجگان آمیر (جے پور) کے شجرات (Pedigree) کی یافت سے یہ بات پایۂ ثبوت
کو پہونچ گئی ہے کہ بھگوان داس فی الحقیقت بھگونت داس کا چھوٹا بھائی تھا جسے لوان کی
جاگیر دی گئی تھی جس پر اس کی اولاد جو "بانکاوت" کہلاتی ہے، ایک عرصہ تک قابض و متصرف
رہی۔ آمیر کے کلیان جی کا مندر، جو غالباً آٹھویں صدی عیسوی کے اواخر یا نویں صدی عیسوی
کے اوائل میں تعمیر ہوا تھا، کی مرمت شہنشاہ اکبر کے عہد میں ہوئی تھی اور اسی وقت

---

[1] طبقات اکبری ایلیٹ وڈاؤسن ۵: ۳۷۲ نیز صفحات مابعد، منتخب (لوئی) ۲: ۱۴۴ و ۲۳۳،
فرشتہ (برگز) ۲: ۲۳۶ و مابعد اردو ترجمۂ فرشتہ از عبدالحیٔ خواجہ ایم اے ۱: ۶۹۶، ۲۰۷، ۲۱۷،
نیز ۲۴۳، مکتبہ ملت دیوبند [2] اکبرنامہ (بیورج) ۲: ۱۳ [3] اس کتبہ کو راجستھان کے محکمۂ آثار قدیمہ
کے افسر آثاریات جناب وجے کمار صاحب نے تلاش کیا ہے۔

کتبہ لگایا گیا تھا جس کا رسم الخط دیوناگری اور زبان راجستھانی ہے جس میں "ش"
(श) کی بجائے "س" (स) کا استعمال کیا گیا ہے مثلاً "پات ساہ" (پادشاہ) وغیرہ۔
اس کتبہ میں آمیر کے عصری حکمراں کی حیثیت سے راجہ بھگونت داس ہی کا ذکر ہے نہ کہ
بھگوان داس کا، کتبہ کی عبارت درج ذیل ہے:

"संवत १६३१ वरषे मांगसीर बदीर पातीसह श्री अकबर राजी
राजाधिराज श्री भगवन्त दास जी क राज प्रोहीत श्री कान्हा
जी प्रसाद मडाये सूत्रधार जगमाल पेरासुत भगवती
तीषताकतर।"

کوی بھوشن (زینت) اور مہاکوی سورج مل میشن (مشرن) نے بھی مان سنگھ کو بھگونت
داس ہی کا بیٹا بیان کرتے ہوئے اس امر کی تصدیق کی ہے کہ آمیر کی حکومت بھگونت
داس کو ہی وراثۃً حاصل ہوئی تھی، جو اکبر کا برادر نسبتی تھا، وہ اپنی تصنیف بھوشن
بھارتی میں لکھتا ہے[1]:-

अकबर पायो भगवंत के तनै सोमान, बहुरि जगत
सिंह महामरदाने सों, भूषपत्या पायो जहांगीर मान सिंह
जूसों, शाहि जहाँ पायो जयसिंह जग जाने सों। अब औरंग
ज़ेब पायो रामसिंह जूसों औरा दिन-दिन पै है, कुरम के
माने सों, केते राजाराय मान पावैं पातसाहन सों, पावैं
पातसाह मान, 'मान' क घराने सों॥

---

[1] ص ۲۵۱۔

سوریہ مل مشرن مان سنگھ کو بھگونت داس کا راجکمار بتلاتے ہوئے اکبر سے انکی رشتہ داری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

कुमार हुतो भगवंत के धरत मान अभि धान
अकबर सालक होय हैं, बालका ब्याह विधान।[1]

قلعہ جموا رام گڈھ (جے پور) کے ایک کتبہ سے، جو جے پور میوزیم میں محفوظ ہے، اس امر کی مزید تصدیق ہوتی ہے کہ بھگونت داس اور بھگوان داس برادر اعیانی تھے اور بڑے ہونے کی حیثیت سے آمیر کی راج گدی بھگونت داس کو حاصل ہوئی تھی نہ کہ بھگوان داس کو۔ جموا رام گڈھ کے قلعہ سے دستیاب کتبہ کی عبارت حسب ذیل ہے :-

"स्वस्ति श्रीमन नृपति विक्रमादित्य राज्यातीत संवत १६६६ सालिवाहन शकातीत १५३४ फालुन शुकल पक्षे ५ रवि वासरे श्री मज्जहांगीर साहि राज्ये वर्तमाने श्री रघुवंश तिलक कछवाह कुलमण्डन श्री राजा पृथ्वी राज तत्पुत्र श्री राजा भारहमल्ल तत्पुत्र श्रीराजा भगवंत दास तत्पुत्र सकल नरेन्द्र चूड़ामीण प्रताप प्राभूत समस्त शत्रुगण समस्त पृथ्वी-विजय प्राप्त महायशोराशि विराजमान श्री महाराजाधिराज मान सिंह नरेन्द्र कारितं रामगढ़ प्रकाराख्यं दुर्गं कृपा-राशिमप-शोभितं तत्र परम पवित्र श्रीपद्माकर

[1] ونش بھاسکر، ۴: ۲۲۳۴۔

पुरोहित पुत्र श्री पुरोहित पीतांबरस्याधिकारे सिद्धं। तत्र कार्य नियुक्त शिल्पिन ॥ स्तद् देशीय निजामच्च। अन्ये च तन्मतानुसारीणः ॥"

صاف ظاہر ہے کہ رام گڈھ کا قلعہ، باغ اور کنواں سمبت ۱۶۶۹ شاکا سمبت ۱۵۳۴ (۱۶۱۲ء) میں راجہ بھگونت داس کے بیٹے مہا راجہ دھراج مان سنگھ نے اپنے پروہت 'پدماکر' کے بیٹے "پیتامبر" کی نگرانی میں تعمیر کروایا۔[1] تاریخ جے پور کے ماہر آنجہانی پروہت ہری نارائن شرما ودیا بھوشن نے اپنے مقالہ "فرزند دولت مہاراجہ شری مرزا راجہ مان سنگھ جی اول" میں مان سنگھ کو بھگونت داس کا پہلا صحیح النسب (Legitimate child) راجکمار بتلایا ہے جس کی ولادت پوس بدی ۱۳ سمبت ۱۶۰۷ مطابق ۲۱ دسمبر ۱۵۵۰ء کو بھگونت داس کی پٹ رانی (پہلی مہارانی) بھاگوتی یا بھگوتی (भगवती) 'بنوار' 'पंवार' کے بطن سے ہوئی، جو بالپورہ کے پچاین 'पिचायण' 'بنوار' کی لڑکی اور "رادھو" کی پوتی تھی۔ اس رانی کے مان سنگھ کے علاوہ مادھو سنگھ، سور سنگھ اور پرتاپ سنگھ یعنی چار لڑکے پیدا ہوئے پرتاپ سنگھ کے بارہ میں بہت کم معلومات فراہم ہوتی رہیں، وہ لاولد تھا اور شاید نوعمری ہی میں فوت ہو گیا۔ اس رانی کے علاوہ بھگونت داس کے بارہ دیگر رانیاں اور خواص (کنیزیں) بھی تھیں۔ مذکورہ چار راجکماروں کے علاوہ اس کے تین راجکمار اور دو راجکماریاں نیز ایک خواص سے بھی دو لڑکے پیدا ہوئے۔ اس طرح بھگونت داس کے کل نو لڑکے اور دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ ان میں مان سنگھ

[1] آمیر کے نزدیک "بھگونت ساگر" نامی تالاب بھی بھگونت داس نے ہی تعمیر کروایا تھا جو اسی کے نام سے مشہور رہا۔

سب سے بڑا تھا۔ راجکماریوں میں سے ایک "مان کنور" کی شادی[1] اس وقت جب کہ بھگونت داس لاہور کا صوبیدار تھا، شہزادہ سلیم کے ساتھ کی گئی (۱۵۸۴ء) یہ سلیم کی پہلی بیگم تھی، جس کی وفات (۱۶۰۴ء) پر شاہزادہ سلیم نے چار روز بتیس پہر تک کچھ نہیں کھایا[1]۔ شہزادی سلطان النساء بیگم (پیدائش ۱۵۸۶ء) اور شہزادہ خسرو (پ ۱۵۸۷ء) اسی کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ شہزادہ خسرو کی پیدائش پر مان کنور (مان بائی)، کو "شاہ بیگم" کا خطاب دیا گیا[2]۔

مذکورالصدر دلائل نیز منشی دیوی پرساد کی تصنیف "شہنشاہ مہاراجہ مان سنگھ والی آمیر کی سوانحعمری" مطبوعہ سمبت ۱۹۴۷ء بارہٹ رام ناتھ رتنو کی "اتہاس راجستھان" مطبوعہ سمبت ۱۹۴۹ء نوآن ٹھکانے کے دستاویز اور پروہت ہری نارائن شرما کی تصنیف اس سلسلہ میں اہم تاریخی مواد فراہم کرتی ہیں۔ ان شواہد کی بنیاد پر کسی تشکیک وارتیاب کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ بھگونت داس' مان سنگھ اول کا باپ اور بھگوان داس چچا تھا۔ جے پور راج گھرانے کے شجرات کے مطابق بھگوان داس کے تین لڑکے۔

---

[1] حوالہ کے لیے ملاحظہ ہو "ہسٹری آف جہانگیر از ڈاکٹر بینی پرساد ص ۲۴، ۲۵،

اس ضمن میں مورخ ہند حضرت علامہ شبلی نعمانی علیہ الرحمہ المتوفی ۱۳۳۲ھ/ نومبر ۱۹۱۴ء کی معرکۃ الآرا نظم معنون "شمیم انگیزیاں عطر محبت کی" بھی قابل مطالعہ ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے:

قرابت راجگان ہند سے اکبر نے جب چاہی — کہ یہ رشتہ عروس کشور آرائی کا زیور تھا

اور آخری شعر: تمھیں اے دیکھنے والو یہ ساری داستاں میں یاد ہے اتنا — کہ عالمگیر ہندو کش تھا، ظالم تھا، ستمگر تھا

زبان زد عوام و خواص ہے [2] بینی پرساد ص ۲۵ مطبوعہ ۱۹۴۰ء تیسرا ایڈیشن۔

اکھے رام، ہر رام اور رنچھوڑ سنگھ تھے، جبکہ بھگونت داس کے آٹھ یا نو لڑکے[1]۔ مان سنگھ، سور سنگھ[2]، پرتاپ سنگھ، مادھو سنگھ[3]، بھیم، کانہا یا کان جی اور بلی رام یا بنمالی داس وغیرہ تھے۔ بھگونت[4] داس کے انتقال ۹۹۸ھ/ نومبر ۱۵۸۹ء کے بعد راجہ مان سنگھ والی آمیر ہوا۔ بہرحال فارسی تاریخوں کے اس تسامح کو رفع کرنے کے لیے ان حضرات کو مزید پیش رفت کرنے کی ضرورت ہے اس سے خاطر خواہ تاریخی مواد فراہم ہو سکتا ہے۔

---

[1] کچھواہہ بنساولی میں راول ہرناتھ سنگھ ڈونڈلو دنے آٹھ اور موہتا نینسی نے اپنی کھیات میں نو اولاد ذکور کا ذکر کیا ہے [2] سور سنگھ کی خدمات کے لیے دیکھے موہتا نینسی ری کھیات [3] مادھو سنگھ کے کارہائے نمایاں کے لیے ملاحظہ ہو "ہسٹری آف جے پور اسٹیٹ" از استاذ محترم ڈاکٹر متھرا لال شرما آنجہانی صدر شعبہ تاریخ دانشگاہ جے پور۔ لٹریری ہیری ٹیج آف دی رولرز آف آمیر اینڈ جے پور از پنڈت گوپال نارائن بوہرا نیز نینسی ری کھیات [4] بھگونت داس اور بھگوان داس کی اسمی مماثلت کی نتیجہ خیز بحث کے لیے ملاحظہ ہو "راجستھان کا اتہاس" ص ۳۵۸-۹، از ڈاکٹر گوپی ناتھ شرما سابق صدر، شعبۂ تاریخ یونیورسٹی جے پور

کیا شیخ سعدی ہندوستان آئے تھے؟

از

جناب رام لعل نابھوی صاحب

شیخ سعدی دنیا کے ان بڑے ادیبوں اور شاعروں میں ہیں جن کی شہرت اور مقبولیت ان کے زمانے سے لے کر آج تک قائم ہے۔ ان کی دو فارسی کی کتابیں گلستاں اور بوستاں تو گھر گھر ملتی ہیں۔ متعدد بار ایڈٹ ہو کر شایع ہوئی ہیں۔ بوستاں کا تو منظوم اردو ترجمہ گوبند پرشاد فضا لکھنوی نے کیا اور وہ نولکشور پریس میں چھپا۔ یہ دونوں کتابیں بچوں سے لے کر بوڑھوں تک کے درس و مطالعہ میں شامل رہی ہیں۔

بوستان کے آٹھویں باب میں "حکایت سفر ہندوستان و ضلالت بت پرستان" کے عنوان سے ایک حکایت درج ہے جس پر کافی لکھا جا چکا ہے۔ لیکن معارف اعظم گڈھ کے جون ۱۹۸۹ء کے شمارہ میں پروفیسر نذیر احمد علی گڈھ نے لکھا ہے:۔

" × × × حال ہی میں دو مقالے و حکایت سفر سومنات سے متعلق امریکا کے دو رسالوں میں نظر سے گذرے۔ ایک انگریزی اور دوسرا فارسی میں، دونوں کے نقطۂ نظر میں بڑی حد تک توافق پایا جاتا ہے۔ فارسی والا مضمون ایران نامہ تابستان

۱؎ معارف: جناب رام لعل صاحب کا مضمون بہت پہلے ملا تھا لیکن اس کی اشاعت کی نوبت اب آئی جس کے لیے شرمندگی ہے۔

۱۳۶۴ھ شمسی - ۱۹۸۵ء میں پروفیسر جلال متینی نے شایع کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ اس حکایت پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا در اصل یہ ایک منظوم مقامہ ہے جس میں داستان فرضی ہوتی ہے۔ اس کو شاعر خود گڑھتا ہے اور اس طرح وہ واقعہ اس کی زندگی سے براہ راست کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ گویا سفر سومنات کی داستان سعدی کی گڑھی ہوئی ہے، اس کو براہ راست ان کی زندگی پر منطبق کرنا درست نہیں × ×"

یہ نظریہ پہلے سے چلا آرہا ہے اور کچھ مضامین میں اس نظریہ کو غلط ثابت کرنے کی کوشش بھی ہوئی ہے، چنانچہ اس مضمون میں اس پر بحث کی گئی ہے کہ اس حکایت کو لکھنے کی شیخ سعدی کی غرض و غایت کیا تھی اور یہ بھی کہ شیخ نے اگر اسے گڑھا ہوتا تو اس کی شکل داستان کی ہوتی نہ کہ اس میں غلط بیانیاں ہوتیں۔ اس حکایت کو صحیح ثابت کرنے کے لیے پینٹنگ بھی بنی جو ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کی کتاب مغل پینٹنگز Moghal Paintinugs میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اس پینٹنگ کی پلیٹ نمبر ۱۹ ہے۔

اس وقت میرے پیش نظر مندرجۂ ذیل کتابیں اور مضامین ہیں جن میں اس مسئلہ پر بحث و گفتگو موجود ہے۔

۱۔ بوستاں مئی ۱۸۴۵ء مطبع دار السلام دار الخلافت شاہجہان آباد صفحہ ۱۹۸، ۱۴۵ سال پرانی

۲۔ تاریخ فرشتہ اردو جلد اول دسمبر ۱۸۹۹ء نولکشور پریس صفحہ ۵۱، ۹۱ سال پرانی

۳۔ رسالہ صمصام ہند ۱۸۸۰ء مطبع سوورشن مراد آباد از منشی اندرمن صفحہ ۹۵/۹۶ ۱۱۰ سال پرانی

۴۔ بہتان سعدی ۱۹۱۸ء رام پریس میرٹھ از منشی گوبند رام ۷۲ سال پرانی

۵۔ حیات سعدی ۱۸۸۸ء مجتبائی پریس لاہور از الطاف حسین حالی صفحہ ۴۲/۴۳ ۱۰۲ سال پرانی

۶- حالات سعدی ۱۹۰۲ء پیسہ اخبار لاہور از منشی احمد حسین صفحہ ۵۱، ۸۸ سال پرانی

۷- حیات سعدی ۱۹۲۳ء رنگین پریس دہلی مولانا شبلی نعمانی صفحہ ۹، ۶۷ سال پرانی

۸- دانش رسالہ اسلام آباد شمارہ ۱۳ مضمون اختر راہی صفحہ ۱۱۱

۹- ہماری زبان نئی دہلی جون ۱۹۸۶ء مضمون رام لعل نابھوی

۱۰- معارف اعظم گڈھ جون ۱۹۸۹ء مضمون پروفیسر نذیر احمد علی گڑھ صفحہ ۴۳۱/۴۳۳

۱۱- مغل پینٹنگز ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ پلیٹ

۱۲- تناظر نئی دہلی کالیداس گپتا نمبر صفحہ ۱۹۵

۱۳- بوستان مترجم منظوم ۱۸۷۸ء نولکشور پریس گوبند پرشاد فضا لکھنوی ۱۱۲ سال پرانی

زیر بحث حکایت کا عنوان بوستان میں یوں درج ہے۔ "حکایت سفر ہندوستان و ضلالت بت پرستاں"۔ خواجہ حالی نے اس کا خلاصہ یوں تحریر کیا ہے:-

"جب میں سومنات میں پہنچا اور ہزاروں آدمیوں کو دیکھا کہ ایک بت کی پرستش کے لیے دور دور سے وہاں آتے ہیں اور اس سے مرادیں مانگتے ہیں تو مجھ کو تعجب ہوا کہ جاندار ایک بے جان چیز کی کس لیے پرستش کرتے ہیں۔ اس بات کی تحقیق کے لیے میں نے ایک برہمن سے ملاقات پیدا کی۔ ایک روز اس سے پوچھا کہ یہ لوگ اس بے حس مورت پر کیوں اس قدر فریفتہ ہیں اور اس کے سامنے مورت کی سخت مذمت اور حقارت کی۔ برہمن نے مندر کے پجاریوں کو خبر کر دی۔ سب نے مجھ کو آن کر گھیر لیا۔ میں نے مصلحتاً ان کے سرگروہ سے کہا کہ میں نے کوئی بات بداعتقادی سے نہیں کہی۔ میں خود اس مورت پر فریفتہ ہوں۔ لیکن چونکہ میں نووارد ہوں اور اسرار نہانی سے ناواقف ہوں اس لیے اس کی حقیقت دریافت

کرنی چاہتا ہوں۔ تاکہ سمجھ بوجھ کر اس کی پوجا کروں۔ اس نے یہ بات پسند کی اور کہا کہ آج رات کو تو مندر میں رہ۔ تجھ کو اصل حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ میں رات بھر وہاں رہا۔ صبح کے قریب تمام بستی کے مرد و عورت وہاں جمع ہو گئے اور اس مورت نے اپنا ہاتھ اٹھایا جیسے کوئی دعا مانگتا ہے۔ یہ دیکھتے ہی سب جے جے پکارنے لگے۔ جب وہ لوگ چلے گئے تو برہمن نے ہنس کر مجھ سے کہا "کیوں اب تو کچھ شبہ باقی نہیں رہا۔ میں ظاہرداری سے رونے لگا اور اپنے سوال پر شرمندگی اور انفعال ظاہر کیا۔ سب برہمنوں نے مجھ پر مہربانی کی اور میرا ہاتھ پکڑ کر اس مورت کے سامنے لے گئے۔ میں نے مورت کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور بظاہر چند روز کے لیے برہمن بن گیا۔ جب مندر میں میرا اعتبار بڑھ گیا تو ایک روز رات کو جب سب چلے گئے میں نے مندر کا دروازہ تو بند کر دیا اور مورت کے تخت کے پاس جا کر غور سے ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا۔ وہاں مجھے ایک پردہ نظر آیا۔ جس کے پیچھے ایک پجاری چھپا ہوا بیٹھا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک ڈور تھی۔ معلوم ہوا کہ جب اس ڈور کو کھینچتا ہے فوراً اس مورت کا ہاتھ اٹھ جاتا ہے۔ اس کو عام لوگ اسکا کرشمہ سمجھتے ہیں۔ اس پجاری نے جب دیکھا کہ راز فاش ہو گیا۔ وہ کھسیانا سا ہو کر وہاں سے بھاگا۔ میں بھی اس کے پیچھے دوڑا اور اس خوف سے کہ کہیں پکڑا کر مروا نہ ڈالے اس کو پکڑ کر ایک کنوئیں میں گرا دیا۔ اس کے بعد میں فوراً وہاں سے بھاگ نکلا اور ہندوستان ہوتا ہوا یمن کے رستے حجاز میں پہنچا۔"[۱]

یہ خلاصہ نہایت نامکمل ہے۔ خواجہ حالی نے شیخ سعدی کے ان اشعار کا خلاصہ نہیں دیا جو محققین کی نظر میں سراسر غلط اور واقعات کے برخلاف ہیں۔ اگر وہ چاہتے تو

اس پورے باب کا احاطہ کرتے ۔ ہر شعر پر بحث کرتے اور صحیح نتیجہ نکالتے ۔ وہ نتیجہ یہ نکالتے ہیں:۔

"اس حکایت پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ ایک ایسے بڑے مندر میں جہاں ہزاروں پجاری اور سیکڑوں بھجن گانے والے مرد اور عورت اور سیکڑوں جاتری شب و روز موجود رہتے تھے وہاں ایک مشتبہ آدمی کو ایسا موقع کیونکر ملا کہ تمام مندر میں اسکے سوا کوئی متنفس باقی نہ رہا اس کے سوائے ایسے سناٹے کے وقت جبکہ مندر میں کوئی متنفس موجود نہ تھا پردہ کے پیچھے ایک پجاری کا ڈور تھام کر بیٹھنا کس غرض سے تھا اور کیوں تھا۔

اس اعتراض کے جواب میں صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید اصل واقعہ یعنی سومنات میں جانا اور مندر میں ہندو بن کر رہنا اور ایک شخص کو اپنی جان کے خوف سے کوئیں میں ڈھکیل کر بھاگ جانا صحیح ہو مگر اس صورت میں یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ اس واقعہ کے تمام جزئیات کی تصویر شیخ سے پوری پوری نہیں کھنچ سکی۔ اصل یہ ہے کہ جب کوئی واقعہ نظم میں بیان کیا جاتا ہے تو شاعر کو اکثر وزن و قافیہ کی ضرورت سے کہیں کہیں اصل مدعا میں ضرور کمی بیشی کرنی پڑتی ہے اور بعض اوقات وہ شاعرانہ خیالات کی رو میں بہہ کر اصل واقعہ سے دور جا پڑتا ہے ......

.... پس اگر اس واقعہ سے کسی کی غرض متعلق نہیں ہوتی تو کسی کو اس کی طرف التفات نہیں ہوتا ورنہ اہل غرض کو اس پر اعتراض کرنے کا موقع ملتا ہے[۱۲]"۔

خواجہ حالی نے اگر حکایت کے اشعار کا احاطہ کیا ہوتا تو شاید وہ اس نتیجہ پر نہ پہنچتے انھوں نے تو اعتراض کا جواب دیا ہی نہیں اور نہ ہی تاریخ فرشتہ کے اس باب کا حوالہ

دیا جس کا عنوان ہے "ذکر سومنات کے توڑنے کا"۔ حقائق سے دانستہ چشم پوشی کی ہے اور اسی لیے قاضی عبدالودود (مرحوم) کو کہنا پڑا اور 'معیات سعدی' کا حوالہ دے کر کہ اس میں بھی حالی نے سعدی کی کذب بیانی کو نظر انداز کیا ہے[۱۳]۔ یہاں تاریخ فرشتہ سے "ذکر سومنات کے توڑنے کا" اقتباس دیا جاتا ہے:۔

" x x اور بت خانہ سومنات میں رات کو یا دن کو خسوف یعنی چاند گہن یا کسوف یعنی سورج گہن واقعہ ہوتا تھا۔ دو تین لاکھ سے زیادہ آدمی جمع ہوتے تھے اور دور تر ممالک سے نذریں اس جگہ لاتے تھے اور جمیع قریہ جو حکام ہندوستان نے سومنات میں وقف کیے تھے قریب دو ہزار کے ہوتے تھے اور ہمیشہ دو ہزار برہمن سومنات کی پرستش کرتے تھے اور شب کو سومنات کو گنگا کے تازہ پانی سے غسل دیتے تھے۔ باوصف اس کے کہ سومنات اور نہر گنگ میں مسافت چھ سو کوس سے زیادہ ہوگی اور ایک زنجیر طلائے خاص دو سو من کی کہ گھڑیال خواہ گھنٹے اس کے اطراف میں بھی گوشہ کنسیہ سے تعبیر کی تھی اور ساعت معین پر اسے حرکت دیتے تھے تو اس کی صدا سے براہمہ کو عبادت کا وقت معلوم ہو دے اور پانسو گائیکیں ناچنے گانے والی اور تین سو مرد سازندہ اس بت خانہ میں ملازم رہتے تھے اور اسی طرح سے تین سو آدمی زائرین یعنی تیرتھ کرنے والوں کے موئے سر تراشی اور ریش تراشی کے واسطے معین تھے x x"۔ [۱۴]

اب اس حکایت کے چند ضروری اشعار نیچے درج کیے جاتے ہیں۔

بتے دیدم از عاج در سومنات — مرصع چو در جاہلیت منات
چناں صورتش بستہ تمثال گر — کہ صورت نہ بندد ازاں خوب تر

مغی راکہ با من سروکار بود | نکوگوی وہم حجرہ و یار بود
بپہین برہمن راستودم بلند | کہ اے پیر تفسیر استا وژند
شبی ہمچو روز قیامت دراز | مغاں گرد من بی وضو در نماز
کشیشاں ہر گز نیاز ردہ آب | بغل ہا چو مردار در آفتاب
بجنگ رایکی بوسہ دادم بدست | کہ لعنت بروباد و بر بت پرست
بتقلید کافر شدم روز چند | برہمن شدم در مقالات ژند
کہ ناچار چون در کشد ریسماں | برآرد صنم دست فریاد خواں
بتازید و من در پیش تاختم | نگونش بچاہی در انداختم

خواجہ حالی کی حیات سعدی ۱۸۸۸ء کی ہے۔ انھوں نے معترض کا نام وغیرہ نہیں لکھا ہے۔ لیکن "رسالہ صمصام ہند" جو ۱۸۸۰ء میں یعنی ۸ سال پہلے چھپا، اس میں غالباً سب سے پہلے اعتراضات کیے گئے ہیں۔ یہ رسالہ منشی اندرمن نے لکھا جو عربی فارسی۔ اردو اور سنسکرت کے بڑے عالم تھے۔ منشی اندرمن لکھتے ہیں :۔

"... پھر سعدی از بس کاذب ہے کیونکہ باب ہشتم بوستان میں کہتا ہے کہ میں سومنات میں آیا اور وہاں ہاتھی دانت سے بنا ہوا ایک بت پایا کہ صبحدم ہاتھ اٹھاتا تھا اور اعجاز دکھلاتا تھا۔ پس میں نے مجاوران سومنات کے سامنے تلبیس و تدلیس سے اپنے تئیں براہمن قرار دیا اور بوقت قابو ان میں سے ایک کو ہلاک کر کے وہاں سے فرار کیا۔ فقط ذرا غور کرو کہ اسبات کی کچھ بھی اصل نہیں ہے کیونکہ زمانۂ سعدی میں سومنات کا وجود ہی نہیں تھا کہ عہد سعدی سے تخمیناً دو سو برس پیشتر محمود غزنوی نے سومنات تباہ کیا تھا نہ بت چھوڑا تھا۔

وہاں نہ بت خانہ بلکہ ابتک بھی وہ مکان ویران پڑا ہے۔ لیکن تھوڑی روز گذرے کہ اہلیابائی نے اس کے پاس ہی نیا مندر بنا دیا ہے جو لوگ کہ علم تواریخ سے بہرہ ور ہیں ان کی رائے پر کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے۔ قطع نظر ازیں سومنات نام ہے ایک مندر عظیم الشان کا جس میں مہادیو کا جوت لنگ رکھا تھا فی الحقیقت وہ لنگ ہی باسم سومناتھ موسوم تھا جو کوئی ہندوؤں کی رسمیاں سے واقف ہے بخوبی جانتا ہے کہ مہادیو کے جتنے لنگ ہیں نہ ان کے ہاتھ ہوتے ہیں نہ پاؤں پس دروغ محض ہے کہ وہ بت صبحدم ہاتھ اٹھاتا تھا۔ قطع نظر ازیں ہندوؤں کے یہاں ہاتھی دانت سے مورت بنانا مروج نہیں ہے۔ درصورتیکہ سعدی اپنے دعویٰ میں سچا ہوتا تو ایسے اظہر من الشمس ملاقات میں خلاف واقعہ بیان نہ کرتا قطع نظر ازیں جو مسلمان کہ ایام طفولیت سے ہندوستان میں مقیم ہیں اور ہندوؤں کے اوضاع و حالات سے بخوبی علیم ہیں اگر قریباً اپنے کو ہندوانہ لباس میں ظاہر کریں تو ممکن نہیں ہے کہ ان کا فریب چل سکے۔ علی الخصوص سعدی کہ اہل ہند کے چال چلن سے کچھ بھی آگاہ نہیں تھا اور کبھی ہندوستان میں نہیں آیا تھا اپنے تئیں براہمن بنائے اور نہ پہچانا جائے۔ حاشا و کلا سعدی تو کس کھیت کی مولی ہے کہ ہندوؤں کو باغ سبز دکھلائے اور قتل سبزۂ بیگانہ از بیخ بر کندہ نہ کیا جاوے اکثر ایرانی و عربی اگرچہ سالہائے دراز ہند میں بود و باش کرتے رہے۔ لیکن الفاظ ہندی زبان سے ہرگز صحیح نہیں برآئے۔ پھر سعدی مجاوران سومنات کو پیر استاد ژند بتاتا ہے اور یہ سرد وسے رووگا تا ہے۔ ابیات

بپہین برہمن را ستودم بلند | کہ اے پیر تفسیر استاد ژند

بہ تقلید کافر شدم روز چند برہمن شدم در مقالات ژند

کون نہیں جانتا کہ استا و ژند زرتشتی مذہب کی کتابیں ہیں۔ زبان پارسی میں، انکو دین ہنود سے کچھ تعلق نہیں ہے کیونکہ ہندوؤں کی کتابیں زبان سنسکرت میں ہیں۔ پس سعدی نے جو برہمنان سومنات کو پر تفسیر استا و ژند کہا ہے سراسر جھوٹ بکا ہے۔ پھر سعدی لاف زن ہے کہ میں نے بت کو بوسہ دیا اور اس حیلہ سے مجاوران سومنات کو خوش کیا چنانچہ ع بتک رایکے بوسہ دادم بدست یہ یک لخت خلاف واقعہ ہے کیونکہ ہندوؤں کے یہاں مورتوں کا لمس بھی بجاوبہ کے سوا ہر شخص کے لیے روا نہیں ہے۔ بوسہ دینے کا تو کیا ذکر ہی۔ پس قول سعدی دروغ صریح و کذب فصیح ہے۔"

"بہتان سعدی" منشی گوبند رام ما بھوی کی تصنیف ہے۔ یہ بھی عربی۔ فارسی۔ اردو اور سنسکرت کے عالم تھے وہ دیباچہ میں لکھتے ہیں :۔

"× × بہرحال اب یکتائے زمن و یش کل بھوشن جناب منشی اندرمن صاحب مرحوم مراد آبادی نے اپنے "رسالہ صمصام ہند" میں مختصراً اس کا رد و قدح کیا۔ جسے دیکھکر ابھی طرز پر راقم نے قصہ کے شعر شعر کا رد لکھا ہے۔ جس میں بدلایل ساطع شیخ جی کا کذب ظاہر کیا گیا ہے × × ×"۔

شیخ سعدی کا ایک شعر ہے۔

مغی را کہ با من سروکار بود نکوگوی و ہم حجرہ دیار بود

منشی گوبند رام کا کہنا ہے کہ مغ آتش پرست زرتشت مذہب کا پیرو ہوتا ہے۔ ہندو اس کو لمس بھی نہیں کرتے پھر اس کا مندر میں کیا کام۔ ہم حجرہ دیار وہ ہو سکتا ہے جس سے

خورد و نوش میں پرہیز نہ ہو اور ہم زبان ہو۔ اس وقت کے ہندو مسلمان کے ساتھ ایک فرش پر بیٹھ کر پانی تک نہیں پیتے تھے پھر ہم حجرہ ہونا کیسا۔ مہنت کا حجرہ مندر کے اقرب ہوتا ہے۔ ایک اور شعر ہے۔

بہ نرمی بہ پرسیدم اے برہمن عجب دارم از کار ایں بقعہ من

منشی جی کا کہنا ہے یہ غلط ہے۔ نہ شیخ صاحب ہندی داں تھے۔ نہ برہمن فارسی خواں پھر گفت و شنید کیسی۔ × × تمام ہندوستان کے سفر سے یہی ایک قصہ قابل اندراج ملا اور عجائبات ہندوستان میں نہ تھے۔ یہ امر بھی حیرت انگیز ہے۔

منشی جی کے نزدیک :۔

شبے ہمچو روز قیامت دراز مغاں گرد من بے وضو در نماز

کشیشان ہرگز نیاز روہ آب (اور) بغلہا چو مردار در آفتاب

ایسے اشعار ہیں جو جھوٹ سے لبریز ہیں، ان کا کہنا ہے کہ تمام ہندو خصوصاً پجاری صبح ہی ضروریات سے فارغ ہو کر پہلے اشنان کرتے ہیں۔ روزمرہ غسل کرنے اور پاک صاف رہنے والوں کی بغلوں سے ہرگز بدبو نہیں آتی۔

منشی جی نے شیخ کے اس شعر

بہ تقلید کافر شدم روز چند برہمن شدم در مقالات ژند

پر بھی سخت اعتراض کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔ "ژند زرتشتیوں کی کتاب ہے۔ برہمن اسکے قائل نہیں۔ پس شیخ جی ایک تو پیدائش سے مسلمان دوسرے مقالات ژند کے زیر فرمان پھر برہمن کبھی نہیں ہو سکتے۔ منشی جی سعدی کے اس شعر

کہ ناچار چوں در کشد ریسماں بر آرد صنم دست فریاد خواں

کے بارے میں لکھتے ہیں کہ پجاری رات کو کس کے دکھانے کے لیے رسی ہاتھ میں لے کر
کھینچ رہا تھا۔ ×× بھلا رسی سے بت ہاتھ تو اٹھا لیتا تھا فریاد خوانی کیونکر کرتا تھا۔ کیا جاندار تھا۔
منشی گوبند رام نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ پورا واقعہ طوفان افزا ہے۔[۵۶]

"حیات سعدی" میں مولانا شبلی نعمانی رقمطراز ہیں :۔

"ہندوستان کے سفر کا ایک واقعہ شیخ نے بوستاں میں لکھا ہے لیکن بیان واقعہ میں
اس قدر غلطیاں ہیں کہ سرے سے اصل واقعہ مشتبہ ہو جاتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ان واقعات
کے بیان میں عام غلطیاں تو یہ ہیں کہ بت کو ہاتھی دانت کا بتایا ہے۔ حالانکہ ہاتھی دانت
کو ہندو پاک نہیں سمجھتے اس لیے اس کا بت نہیں بنا سکتے۔ برہمنوں کو لکھا ہے کہ
وہ پاژند پڑھتے تھے۔

چو سگ با من از بہر آں استخواں فتادند گبراں پاژند خواں

حالانکہ پاژند ہندوؤں کی کتاب نہیں پارسیوں کا صحیفہ ہے۔ برہمنوں کو کہیں گبر اور کہیں مطران کہتے ہیں۔
ع پس پردہ مطران آذر پرست۔ حالانکہ مطران عیسائیوں کے پادری کو کہتے
ہیں۔ پھر مطران کو آذر پرست کہنا اور بھی لغویت ہے۔ ان جزئیات کے سوا اصلی
واقعہ بھی نہایت دور از قیاس ہے۔ شیخ کتنی ہی بت پرستی کرتے لیکن یہ ناممکن تھا
کہ ایک ایسے عظیم الشان بت خانہ میں تمام برہمن اور پجاری اکیلے ان کے ہاتھ میں
بت خانہ چھوڑ کر باہر نکل جاتے اور ان کو یہ موقع ملتا کہ چاروں طرف سے دروازے
بند کر کے جو چاہتے کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ تازہ ولایت تھے۔ خدا جانے کس چیز کو
کیا سمجھے اور کس واقعہ کو کیونکر لکھ گئے۔"[۵۷]

"حالات سعدی" میں منشی احمد حسین خاں لکھتے ہیں :۔

"میں کہتا ہوں اس روایت میں کوئی بات فوق العادت یا سوپر نیچرل نہیں ہے۔
شیخ نے ظاہر داری سے وہاں اپنا رنگ ایسا جمایا کہ تمام پجاری اسے برہمن ہی سمجھے
رہے کیا عجب ہے کہ یہ فعل اس نے ایسے موقع پر کیا ہو جبکہ مندر میں کسی اتفاق سے
کوئی موجود نہ تھا اور چاروں طرف سے مطلع صاف تھا۔ شیخ مرحوم نے یہ واقعہ نظم
میں بیان کیا ہے اس کو پابندی نظم مدنظر تھی۔ اسے حسن بیان اور زینت الفاظ کا
خیال تھا۔ پس اگر وہ قصہ کی تمام جزئیات کے بیان کرنے میں قاصر رہا تو اس میں
کوئی اچنبا نہیں۔"[۵۸]

منشی احمد حسین نے واقعہ کی تہہ میں جا کر اور اعتراضات کی چھان بین کیے بغیر
خواجہ حالی کے تجزیہ کو ہی دہرا دیا ہے جس کے بارے میں تفصیل سے پہلے لکھا جا چکا ہے۔
سوال واقعہ نظم کرنے کا نہیں بلکہ یہ ہے کہ کیا واقعہ صحیح بھی ہے یا محض بہتان ہے۔

"دانش" اسلام آباد کے شمارہ ۱۲ میں ڈاکٹر اختر راہی اپنے مضمون برصغیر پاک و ہند میں
مطالعۂ سعدی کے پہیرا "کیا شیخ سعدی ہندوستان آئے تھے؟" میں رقمطراز ہیں :۔

"××× حقیقت یہ ہے کہ یہ نظم شیخ سعدی کی کاوش طبع کا نتیجہ ہے مگر واقعہ
سنا سنایا ہے جو اخلاقی نصائح پیش کرنے کے لیے صیغۂ متکلم میں نظم کر دیا گیا ہے
یہ ضروری نہیں کہ جو کچھ ادب میں صیغۂ متکلم میں بیان کیا جائے وہ یقیناً آپ بیتی کا
حصہ ہو۔ "بوستاں" اور "گلستاں" کی بعض دوسری حکایات اور شیخ سعدی کی
ذاتی زندگی کے درمیان تطبیق اس طرح ممکن ہے کہ ان حکایات کو آپ بیتی کے بجائے
جگ بیتی کا حصہ خیال کیا جائے۔

بوستاں سے سومنات اور ہندوستان کے سفر کی موہوم اطلاع سے آگے

بڑھ کر دہلی میں شیخ سعدی کی آمد کی روایت بھی بیان کی گئی ہے اور مقصد سفر یہ بتایا گیا ہے کہ وہ امیر خسرو سے ملنے آئے تھے۔ حیرت ہے کہ شیخ سعدی جیسا شاعر دہلی آئے اور معاصر مورخین اس کے بارے میں خاموش رہیں۔ حتیٰ کہ جس شخص کی کشش انہیں دہلی کھینچ لائے وہ دنیا بھر کی اطلاعات دینے کے باوجود اس ملاقات کے بارے میں کچھ نہ لکھے۔

مذکورہ بالا بحث سے واضح ہے کہ شیخ سعدی کی برصغیر آنے کی روایت مشتبہ ہے اور تاریخی طور پر پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی۔"[۵۹]

آخر میں ہم پروفیسر نذیر احمد علی گڑھ کی رائے دیتے ہیں:۔

" × × سفر کے بارے میں جو معلومات ہیں وہ بھی شبہ سے پاک نہیں۔ × × ان کی شہرت کا معاملہ غلط معلوم ہوتا ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر سعدی کی متذکرہ بالا حکایت مشتبہ ہو جاتی ہے۔

اسی طرح سعدی کے قیام سومنات کا معاملہ ہے۔ سعدی نے سفر سومنات کا ذکر بوستاں کی ایک طویل حکایت میں کیا ہے۔ اگرچہ اس واقعہ میں کوئی تاریخی قباحت نہیں البتہ واقعہ میں اسقدر غلطیاں ہیں کہ سرے سے اصل واقعہ ہی مشتبہ ہو جاتا ہے۔ بت کو ہاتھی کے دانت کا بتایا ہے۔ ہاتھی کے دانت کے بت نہیں ہوتے۔ برہمنوں کو پاژندخواں بتایا ہے۔ پاژند اول کتاب کا نام نہیں۔ دوم اس کا تعلق زردشتیوں سے ہے۔ ژند کو براہمنوں کی طرف منسوب کیا ہے برہمن شدم در مقالات ژند۔ برہمن کو گبر اور مطران کہا ہے۔ گبر کا تعلق بھی زردشتیوں سے ہے اور مطران کا عیسائیوں، برہمن مطران آذر پرست کہا گیا ہے۔

جو نہایت لغو ہے۔ برہمنوں کے لیے ایسی اصطلاحات بیان کی گئی ہیں جن میں سے بعض کا تعلق زردشتیوں سے، بعض کا عیسائیوں سے اور بعض کا مسلمانوں سے ہے ان کے علاوہ اصل واقعہ میں بھی دور از قیاس باتیں ہیں۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ تمام برہمن اور پجاری سعدی کے ہاتھ میں بت خانہ چھوڑ کر باہر نکل جائیں اور اس طرح ان کو موقع دیں کہ وہ چاروں طرف کے دروازے بند کر کے جو چاہیں کریں"۔

پروفیسر جلال متینی کی رائے پر جس کا ذکر شروع میں ہوا ہے۔ پروفیسر صاحب کا فرمانا ہے:۔

" بہت ممکن ہے کہ متینی صاحب کی رائے ہمارے لیے قابل قبول نہ ہو۔ بہر حال انھوں نے گلستاں اور بوستاں کی ان داستانوں میں مندرج واقعات کی توجیہ کی ہے جو بادی النظر میں تاریخی لحاظ سے غلط معلوم ہوتے ہیں۔"[۶۰]

شیخ سعدی کی غرض و غایت اس واقعہ کو بتانے سے بت پرستوں کی ضلالت بتانا ہے۔ اسطرح ہندوؤں خصوصاً براہمنوں کی مذمت بھی انھوں نے کر دی ہے جو غلط ہے، یہ واقعہ داستان نہیں، اس میں تبلیغ کا شائبہ ہے۔ داستان یا قصہ میں داستان کا رنگ ہوتا ہے۔ کسی مورخ نے آج تک یہ نہیں کہا کہ شیخ سعدی ہندوستان آئے تھے۔ ناقدوں نے اس قصے کی جزئیات کو غلط بتایا ہے اور واقعہ کو لغو سراسر بہتان۔ ان ہی کتابوں میں شیخ سعدی کی غلط بیانیوں کا ذکر اور بھی ہوا ہے۔ چونکہ بوستان کے اس واقعہ کو آج بھی صحیح بتانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اس لیے ہمیں ضرورت پڑی کہ مختلف کتب۔ مضامین۔ پنٹنگ سے

اور اس معاملہ کی گہرائی میں جانچ کر کے حقایق پیش کریں۔ تاریخ فرشتہ، ٹیپو سلطان کی کتابیں۔ امیر خسرو کی کچھ تحریریں بھی نفرت اور حقارت کا مظہر ہیں۔

حوالجات

۱؎ حیات سعدی از خواجہ الطاف حسین حالی۔ صفحہ ۳۷/۳۹

۲؎ ایضاً صفحہ ۳۹

۳؎ تناظر کالیداس گپتا نمبر۔ دہلی ۱۹۸۴ - ۱۹۸۵ صفحہ ۱۹۵

۴؎ ترجمہ تاریخ فرشتہ اردو جلد اول نولکشور صفحہ ۵۱

۵؎ رسالہ صمصام ہند صفحہ ۹۵/۹۶

۶؎ بہتان سعدی از منشی گوبند رام —

۷؎ حیات سعدی از مولانا شبلی نعمانی صفحہ ۸/۹

۸؎ حالات سعدی از منشی احمد حسین خاں صفحہ ۵۱

۹؎ دانش اسلام آباد شمارہ ۱۳ صفحہ ۱۱۱

۱۰؎ معارف اعظم گڑھ جون ۱۹۸۹ء صفحہ ۴۳۱/۴۳۳

بہرائچ کے بعض صوفیہ کرام

از

جناب معین احمد علوی

۱۔ شیخ فیروز ترک بخاریؒ

ان کا مزار بہرائچ عیدگاہ کے شمال میں دریائے سرجو کے کنارے بلندی پر واقع ہے۔ یہ نہایت پُر فضا اور پُر سکون جگہ ہے جہاں اللہ کی یاد میں جی خوب لگتا ہے عرف عام میں یہ جگہ "فیروز شہید" کے نام سے مشہور ہے شیخ فیروز مولانا عبدالحق محدث دہلوی کے اجداد میں ہیں۔ مولانا نے اپنی مشہور کتاب اخبار الاخیار کے ضمیمہ میں انکا مفصل حال قلم بند کیا ہے۔ اردو میں خلیق نظامی صاحب نے "حیات شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ" میں اس کی مزید تفصیل تحریر کی ہے۔ شجرۂ نسب یہ ہے۔

آغا محمد ترک بخاری۔ (زمانۂ علاؤالدین خلجی)

|

ملک معز الدین

|

ملک موسیٰ

|

شیخ فیروز

شیخ سعد اللہ

شیخ رزق اللہ مشتاقی — شیخ سیف الدین

شیخ عبد الحق محدث دہلوی

اس طرح شیخ فیروز شیخ محدث علیہ الرحمہ کے پردادا تھے۔ جن کے لیے شیخ نے "جد حقیقی ما" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اس خانوادہ کے آغا محمد ترک بخاری ترکوں کی ایک بڑی جماعت کے ہمراہ ہندوستان تشریف لائے۔ شاہ عبد الحق صاحب اخبار الاخیار میں لکھتے ہیں:۔

ترکوں کی ایک بڑی جماعت بھی جو ان سے سلسلۂ قرابت رکھتی تھی اپنے اصلی وطن سے منتقل ہوکر ان کی خدمت میں یہاں آگئی"

یہ سلطان علاؤالدین خلجی (۱۲۹۶ء - ۱۳۳۶ء) کا زمانہ تھا جو مسلمانان ہند کے سیاسی وثقافتی عروج کا دور تھا۔ سلطان نے آغا محمد ترک کی دستگیری کی اور انکو اعلیٰ مدارج سے نوازا۔ ۶۹۸ھ مطابق ۱۲۹۸ء میں جب خلجیوں نے گجرات پر حملہ کیا (خزائن الفتوح امیر خسرو صفحہ ۵) تو سلطان نے ان کو گجرات اور اس کے بندرگاہوں کی فتح کے لیے سپہ سالار الغ خان اور نصرت خان کے ساتھ کر دیا۔ شیخ محدث لکھتے ہیں:۔

"وہ بڑے امرا کی ایک جماعت کے ساتھ ملک گجرات اور اس کے بندرگاہوں کی فتح پر مامور ہوئے اور اس مہم کی انجام دہی میں شاہی حکم سے وہیں مقیم ہو گئے"

(اخبار الاخیار صفحہ ۲۸۹۔)

آغا محمد ترک نے گجرات کی فتح کے بعد وہیں سکونت اختیار کر لی۔ اللہ نے انکو کثیر اولاد دی تھی۔ ایک سو ایک بیٹے تھے۔ جن کے ساتھ وہ نہایت شان وشوکت، عزت ووقار، سکون اور اطمینان کے ساتھ دن گزارتے تھے لیکن ایک ہولناک حادثہ میں تمام لڑکے انتقال کر گئے۔ صرف سب سے بڑے فرزند معزالدین باقی بچے، اس کے بعد دنیا کی طرف سے ان کا دل اچاٹ ہوگیا اور سب کچھ خیر باد کہہ کر دہلی چلے آئے اور شیخ صلاح الدین سہروردی کی خانقاہ میں بیٹھ گئے۔ وہ شیخ صدرالدین سہروردی کے مرید اور خلیفہ اور شیخ نصیرالدین محمود چراغ دہلی کے معاصر اور ہمسایہ تھے۔

اخبار الاخیار سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان غیاث الدین تغلق (۱۳۲۰ء-۱۳۲۵ء) کے عہد تک گجرات رہے اور ۱۷ ربیع الآخر ۷۳۹ھ مطابق ۱۳۳۸ء یعنی سلطان محمد تغلق کے زمانہ میں آغا محمد ترک نے دہلی میں وفات پائی اور عیدگاہ شمسی کے عقب میں دفن ہوئے۔

ملک معزالدین سے خاندانی سلسلہ جاری ہوا۔ خدائے تعالیٰ نے ان کو بڑی صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں شیخ محدث لکھتے ہیں:۔

"حق تعالیٰ نے ملک معزالدین کو یہ مرتبہ دیا تھا کہ گویا سو انسانوں کی استعداد اور فیضان ان کو تنہا عطا فرما دیا"

ملک معزالدین نے خاندان کے ماتمی ماحول کو ختم کر کے دہلی میں سکونت اختیار

کی۔ ان کے بعد ان کے فرزند ملک موسیٰ نے بڑی عزت اور شہرت حاصل کی۔

فیروز تغلق (المتوفی ۱۳۸۸ء) کے بعد دہلی کے سیاسی حالات اس قدر ناگفتہ بہ ہوگئے کہ علما و مشائخ اسے چھوڑ کر گجرات، جونپور، بنگال اور دوسرے علاقوں کی طرف متوجہ ہوجانے کے لیے مجبور ہوگئے۔ ملک موسیٰ بھی بددل ہوکر ماوراء النہر چلے گئے۔ (اخبار الاخیار، ۲۹۰)

لیکن وہاں زیادہ عرصہ تک رہنا نصیب نہ ہوا۔ جب تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا (۱۳۹۸ء) تو ملک موسیٰ اس کی فوج کے ہمراہ پھر ہندوستان آگئے۔ شیخ محدث نے لکھا ہے:

"صاحب قران امیر تیمور گورگان کے ساتھ دہلی آئے اور اپنے بزرگوں کے سلسلہ کا احیاء کیا اور یہاں مستقل سکونت اختیار کی۔"

ملک موسیٰ کے کئی بیٹے تھے۔ ان میں شیخ فیروز امتیازی شان رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے خاندان کی شہرت اور عظمت کو چار چاند لگا دیے۔ وہ علم سپہ گری۔ شعر و شاعری۔ سخاوت و لطافت سب میں یکتائے زمانہ سمجھے جاتے تھے شیخ محدث انکی بابت لکھتے ہیں:

"وہ ظاہری باطنی اور وہبی و کسبی فضائل کے جامع تھے، سپاہ گری میں اپنے زمانے میں بے مثل تھے اور فن جنگ میں بے نظیر سلیقہ رکھتے تھے۔ علم شعر، شجاعت و سخاوت خوش طبعی بذلہ سنجی، عشق و محبت اور دیگر خوبیوں میں ان کا جواب نہ تھا اور دولت و حشمت، جاہ و مرتبہ عزت و عظمت میں بے عدیل تھے۔ شاعری اور خوش طبعی کی بنا ہمارے خاندان میں ان ہی سے پڑی (اخبار الاخیار ۲۹۰)

انھوں نے سلطان بہلول لودی اور سلطان حسین شرقی کی جنگ کا پورا واقعہ نظم کیا تھا اس کے دو شعر شیخ محدث نے نقل کیے ہیں۔ حسین شرقی بہلول لودی کو مخاطب کرکے کہتا ہے ؎

ایا قابض شہر دہلی شنو — حیاتت چہ خواہی ازیں جا برو

منم قابض ملک مارا است ملک — خداداد مارا خدا داست ملک

شیخ فیروز ۸۶۰ھ/۱۴۵۵ء میں بہرائچ کے کسی معرکے میں شہید ہوئے اور وہیں سپرد خاک کیے گئے۔ لڑائی پر جانے سے قبل انکی بیوی نے جو ان دنوں حاملہ تھیں ان کو روکنے کی کوشش کی تو جواب دیا۔

"میں نے خدا سے دعا کی ہے کہ بیٹا ہو اور اس سے نسل چلے اس کو اور تم کو خدا کے سپرد کرتا ہوں نہ معلوم اب مجھے کیا پیش آئے" (حیات شیخ محدث ص۵۶)

کچھ دنوں کے بعد شیخ سعد اللہ پیدا ہوئے جو شیخ محدث کے دادا تھے۔ وہ بھی بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے اور ان میں اپنے شہید باپ کے سب اوصاف پائے جاتے تھے۔

شیخ فیروز کے مزار پر عموماً جمعرات کے دن خاص رونق رہتی ہے۔ عیدین کے موقعوں پر تمام پڑھی لکھی آبادی عقیدت سے حاضری ضرور دیتی ہے۔ مزار پرانا اور ایک اونچے چبوترے پر ہے۔ درختوں کی گھنی چھاؤں، دریا کا کنارہ، پُرفضا بلندی اور سکوت عبادت کی دعوت دیتے نظر آتے ہیں۔

۲۔ حضرت شاہ بڈھن بہرائچی

شاہ بڈھن بہرائچی

حضرت سید بڈھن بہرائچی اپنے زمانہ کے مشہور مشائخ اور حضرت قاضی سید عبدالملک المعروف شاہ اجمل کے اجل خلفا میں تھے۔ سلسلۂ چشتیہ سہروردیہ

مداریہ۔ قادریہ تمام سلسلوں میں اجازت وخلافت انھیں سے پائی۔

حضرت شیخ عبدالمقتدر بن رکن الدین شریحی کے واحد شاگرد۔ مخدوم شیخ حسام الدین فتح پوری سے تعلیم حاصل کی اور اول انھیں سے سلسلۂ چشتیہ کی اجازت پائی۔ خزینۃ الاصفیا میں ہے کہ "از اکمل خلفائے ویست" (ان کے بڑے کامل خلفا میں تھے)

سلسلۂ نسب سادات حسینی سے ملتا ہے۔ ان کے بزرگ ساتویں ہجری میں کاشغر سے وارد ہوکر بہرائچ میں متوطن ہوئے یہ اور شاہ اجمل بہرائچی ایک ہی خاندان سے تھے۔ قاضی جمال الدین چندن کے بھائی قاضی دانیال کے یہاں رشتہ قائم ہونے کیوجہ سے انھوں نے بہرائچ میں توطن اختیار کیا۔

تاریخ آئینہ اودھ کے مصنف مولانا ابوالحسن مانکپوری ۱۸۷۰ء کے قریب بہرائچ آئے تھے اور تحقیقات کی تھی وہ لکھتے ہیں:۔

"مولانا سید مخدوم بڈھن کی طہارتِ نسب میں کوئی شک نہیں مگر علی الاتصال شجرۂ نسب پدری مولف کو نہ ملا۔ اسی باعث لکھنے سے معذوری ہے۔ بالفعل انکی اولاد میں سید ابوالحسن صاحب نواسۂ شاہ نعیم اللہؒ و خلف الرشید مولانا شاہ بشارت اللہ صاحب باقی ہیں اور علاتی بھائی حافظ محمد اسماعیل و محمد خلیل و محمد موسیٰ ہیں۔

کچھ دیہات ان کے خاندان میں باقی تھے۔ عملداری عہد انگلشیہ میں اکثر قانونی سے ایک تعلقدار کے قبضہ میں جاتے رہے اب محض توکل پر بسر اوقات ہے۔ موجودہ اسٹیشن بہرائچ انہی کی زمین پر تعمیر ہوا۔ اس کے علاوہ موضع رکابی پرگنہ فخرپور تحصیل قیصر گنج بھی ان کی معافی میں تھا۔ موجودہ مزار کے چاروں طرف کی زمین بااثر لوگوں نے قبضہ کرلی۔"

مکان محلہ بڑی ہاٹ میں اس جگہ واقع تھا جہاں اب معزالدین صاحب کے لڑکے رہتے ہیں۔ یعنی املی کے نیچے اکھاڑے کے جنوب میں، مزید حالات معلوم نہ ہوسکے۔

مولانا شاہ محمد اسلم صاحب جانشین خانقاہ نعیمیہ نے خود راقم سے بیان کیا کہ میرے نانا مولانا شاہ ابومحمد صاحب نواسہ شاہ نعیم اللہؒ متوفی ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۶ء کی ایک تحریر ہمارے خاندانی کاغذات میں محفوظ ہے جس سے معلوم ہوا کہ بہرائچ کی آبادی پہلے پھوس کے چھپروں سے گاؤں کے انداز پر آباد تھی۔ پختہ مکانوں میں صرف ہمارا ہی پہلا مکان تھا جو مولسری والی مسجد سے ملحق اب بھی موجود ہے۔ اس کی تاریخ تعمیر "این است محل برکت" یعنی زمانۂ شہنشاہ جہانگیر ہے۔ زمانہ قدیم میں پھونس کے مکانات ہونے کی وجہ سے بہرائچ میں دوبار بھیانک آگ لگی۔ جس میں لوگوں کا اثاثہ ضایع ہوگیا۔ اسی آگ میں شاہ بڈھن کے گھر کا اثاثہ قیمتی نوادرات اور نسخ سب ضایع ہوگئے، اسی وجہ سے کچھ تفصیل نہیں ملتی۔ خزینۃ الاصفیا جلد اول (ص ۳۷۰) پر معارج الولایت کے حوالہ سے منقول ہے کہ ایام خوردسالی سے حضرت مخدوم حسام الدین فتحپوری قدس سرہٗ کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی اور کمال ظاہری اور باطنی کو پہونچے اور خود حضرت مخدوم کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"از اولیائے نامدار و مشائخ باوقار است و خلقے کثیر بتوجہ موجہ خویش بخدا رسانید۔

بڑے نامی گرامی اولیا میں تھے۔ بڑا وقار تھا۔ بڑی آبادی کو اپنی توجہ سے خدا تک پہونچا دیا۔

شیخ بڈھن کے والد ان کو چھ برس کی عمر میں حضرت مخدوم شیخ حسام الدین فتحپوری کی خدمت میں لے گئے اور عرض کی۔

چندان پسرانم قبل ازین بعالم طفولیت
ضایع شده اند۔ حالا می خواهم کہ این
پسر بدعائے شما از عمر طبعی برخوردار
باشد۔ فرمود کہ انشاء اللہ تعالیٰ
پیر کبیر خواہد شد۔ باز عرض کرد کہ
قدرے علم ہم نصیب این برخوردار
گردد بہتر است۔ فرمود کہ عالم متبحر
گردد۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ باز بعرض
پرداخت کہ علم بے معرفت قدرے
ندارد۔ فرمود کہ بعنایت ربانی ہم عارف
وہم عمر دراز خواہد شد۔ پس حسب
فرمودہ شیخ بوقوع آمد کہ شیخ بڈھن
بہمہ اوصاف موصوف بود

اس سے پہلے میرے چند لڑکے بچپن ہی میں
فوت گئے اب میں چاہتا ہوں کہ آپ کی دعا
سے یہ اپنی طبعی عمر کو پہونچ کر پھلے پھولے۔
فرمایا کہ انشاء اللہ پیر کبیر ہوگا میں نے
عرض کیا کہ اچھا ہو کچھ لکھ پڑھ جائے
فرمایا کہ بڑا عالم ہوگا۔ انشاء اللہ۔
پھر عرض کیا کہ علم بے معرفت
کسی کام کا نہیں۔ فرمایا خدا نے
چاہا یہ عارف ہوگا اور بڑی عمر
پائے گا۔ پس جیسا کہ شیخ نے
فرمایا۔ ویسا ہی ہوا اور شیخ
بڈھن ان تمام کمالات سے
متصف ہوئے۔

مخدوم شیخ بڈھن نے ۸ شوال ۸۸۰ھ کو وفات پائی۔ مزار پُرانوار بہرائچ میں زیارت گاہ خلائق ہے۔ ریلوے اسٹیشن جانے والی سڑک کے پورب جانب پڑتا ہے پہلے ایک بڑا املی کا درخت چبوترہ پر سایہ فگن تھا ۱۹۶۰ء کے قریب منتظمین نے املی کا درخت کٹوا کر نئے سرے سے چبوترہ کی مرمت کرا کے مزار پر چھت قائم کردی۔

مسالک السالکین فی تذکرۃ الواصلین جلد دوم ص۱۴۲ میں ذیل کا قطعہ تاریخ وفات دیا ہے۔

مقتدائے طریقت احسن — شیخ اہل جہاں شہ بڈھن

رفت زین جہان حزن و ملال — ہشتمین بود از مہ شوال
سال ترحیل آن خرد فرمود — صاحب کشف شاہ بڈھن بود
۸۸۰

وفیات الاخیار میں آپ کی تاریخ وصال غلط ہے۔ اس کتاب میں عموماً تاریخیں غلط ہیں۔
مولانا محمد اسلم صاحب نے فرمایا کہ ہمارے خاندان میں ثقہ بزرگوں کے ذریعہ جو دو روایات سینہ بسینہ محفوظ چلی آرہی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت مخدوم بڈھن رمضان شریف میں پیدا ہوئے۔ دن میں کبھی آپ دودھ نہیں پیتے تھے۔ دوسرے ان کے سر کے بال بوقت پیدائش سفید تھے۔ صاحب نزہۃ الخواطر کا بیان ہے کہ "سلسلۂ مداریہ و سہروردیہ اور دوسرے طریقوں میں حضرت شیخ اجمل بن اجمد حسینی بہرائچی ثم جونپوری سے اجازت پائی اور حضرت محمد بن القاسم سے بھی فیض حاصل کیا"۔ (جلد سوم ص۴۵)

۳۔ قاضی سید عبدالملک مشہور بشاہ اجمل بہرائچی

یہ علوم شریعت و طریقت کے جامع، ورع و تقویٰ میں بلند پایہ اور اپنے زمانہ کے نامور مشائخ میں تھے۔ سلسلۂ عالیہ چشتیہ، قادریہ و سہروردیہ میں حضرت جلال الدین بخاری مشہور بہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے مرید و خلیفہ تھے۔ خرقۂ خلافت حضرت قاضی شیخ قوام الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے پایا تھا جو حضرت شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی کے مرید و خلیفہ تھے اور ان کی وفات کے بعد حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی خدمت میں حاضر ہو کر مرتبہ تکمیل اور درجۂ خلافت حاصل کیا۔
(مسالک السالکین)

سلطان ابراہیم شرقی بادشاہ جونپور کو ان سے بڑی عقیدت تھی۔ اس نے اپنی سلطنت میں ان کو صدر جہان کے عہدہ پر ممتاز کیا تھا۔ ان کے لیے دریا کے

کنارے نہایت خوبصورت مسجد بنوائی تھی جو آج بھی جھجھری مسجد کے نام سے مشہور ہے سلطان کا ایک شاہزادہ اور خود سلطان بھی ان کی خانقاہ کے قریب دفن ہیں (تجلی نور جلد اول ص۵) ایک مرتبہ سلطان ان کو اپنے ساتھ بنگالہ کی مہم پر بھی لے گیا تھا۔ (معارف مئی ۱۹۴۳ء مضمون ملا محمود جونپوری) تلاش و تفحص کے باوجود ابتدائی حالات نہیں معلوم ہو سکے۔ مولانا عبدالحق محدث دہلوی اپنی کتاب اخبار الاخیار (ص۱۷۳) میں لکھتے ہیں کہ:۔

سیدے بود او را شیخ اجمل می گفتند	ایک سید تھے جن کو شیخ اجمل کہتے ہیں اپنے وقت
از اکابر وقت بود	کے بزرگوں میں شمار ہوتے تھے۔

ایک بار قاضی شہاب الدین دولت آبادی وزیر سلطنت جونپور اور قاضی صدر جہاں سید اجمل بہرائچی سے کسی امیر کی محفل میں آگے پیچھے بیٹھنے پر کچھ چشمک اور گفتگو ہوگئی۔ قاضی شہاب الدین علم میں ان سے زیادہ متبحر تھے۔ ان کے دل میں وزارت عظمٰی کے ساتھ علم کے وقار کا سوال بھی پیدا ہوا۔ شاہ اجمل سے یہ کہہ کر کہ آپ کا علم مشکوک اور مشتبہ ہے اس لیے مجھ کو آگے بیٹھنا چاہیے۔ بیٹھنے میں سبقت لے گئے تھے اور سید صاحب بوجہ آل رسول ہونے کے اپنی افضلیت چاہتے تھے۔ غرضکہ یہ بحث چل پڑی اور قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے ایک رسالہ علم کی افضلیت پر لکھ ڈالا لیکن جب قاضی صاحب کے استاد کو اس بحث اور رسالہ کی اطلاع ہوئی تو ان کو یہ جسارت پسند نہ آئی اور ان کی طرف سے مزاج میں برگشتگی پیدا ہوگئی۔

اخبار الاخیار ص۱۷۳ میں ہے کہ:۔

استاد قاضی شہاب الدین را ایں	قاضی شہاب الدین کے استاد کو یہ (جرأت)

از وے ناخوش آمد و مزاج از وے منحرف گشت	پسند نہ آئی اور انکی طرف سے مزاج میں برگشتگی پیدا ہوگئی۔

قاضی شہاب الدین کو جب استاد کی خفگی کا علم ہوا تو انھوں نے استاد کی خفگی کو دور کرنے کے لیے

کتابے کہ تصنیف کردہ بود در دریا	قاضی صاحب نے اپنی تصنیف کردہ کتاب کو
انداخت بجائے آن در مناقب سادات	دریا میں ڈبو کر سادات کی افضلیت و تقدس
رسالہ تالیف کرد۔ (خزینۃ الاصفیا ج۱ ص۳۹۱)	میں رسالہ تصنیف کیا۔

اور سابقہ خیال سے رجوع کر کے استاد کی خدمت میں عذر و معذرت پیش کی۔ (اخبار الاخیار ص۱۷۶) مولانا قاضی اطہر مبارکپوری اپنے مضمون (معارف جون ۱۹۶۱ء) میں استاد سے مراد حضرت سید اشرف جہانگیر (کچھوچھہ شریف) متوفی ۸۰۸ھ لیتے ہیں۔ کیونکہ اس تصنیف کے وقت قاضی صاحب کے دوسرے اساتذہ خواجہ عبدالمقتدر اور مولانا خواجگی (کالپی) وفات پا چکے تھے۔ صرف حضرت اشرف جہانگیر سمنانی حیات تھے۔ ان کو سادات اور اہلبیت سے اس قدر عقیدت و محبت تھی کہ اہل سنت والجماعۃ کے محتاط مسلک کے باوجود یزید پر لعنت کے جواز میں ایک کتاب لکھدی تھی۔

اس زمانہ کے مشہور عالم شیخ مشید بن مخدوم شیخ محمد بن خضر (والد ملا محمود جونپوری) متوفی ۸۱۱ھ سے ان کے بڑے تعلقات تھے۔ دونوں بچپن کے ساتھی اور ایک دوسرے کے غم خوار تھے۔ صدر جہاں سید اجمل نے بارہا سلطان کی طرف سے اور خود اپنی طرف سے التماس کی کہ بار خاطر نہ ہو تو فقرا اور واردین و متعلقین کے لیے کچھ جاگیر قبول فرمالیں۔ مگر شیخ مشید کسی طرح آمادہ نہ ہوئے جب سید شاہ اجمل کا اصرار بڑھا تو استخارہ کے بعد پرگنہ محمد آباد میں ولید پور وغیرہ بارہ۱۲ قریات

قبول کرلیے۔

حضرت شاہ اجمل کو سلاسل سبعہ میں اجازت و خلافت تھی (معمولات مظہریہ [۲۳])
اس کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

(۱) سلسلۂ چشتیہ نظامیہ۔ میں حضرت جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشت سے اجازت و خلافت ملی جو حضرت نصیر الدین محمود چراغ دہلی کے خلیفہ تھے۔

(۲) سلسلۂ مداریہ قلندریہ۔ میں حضرت بدیع الدین شاہ مدار سے اجازت پائی۔ (تذکرۃ المتقین [۱] فی احوال خلفائے سید بدیع الدین ج ۲۔ ص ۱۲۶)

(۳) سلسلۂ قادریہ
(۴) سہروردیہ
(۵،۶) کبرویہ اور فردوسیہ
} میں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت سے ان کو اجازت ملی (معمولات مظہریہ)

ان کے خلفاء میں حضرت مخدوم بڈھن بہت مشہور ہوئے جو بہرائچ میں مدفون ہیں۔ ان کے خلیفۂ اجل حضرت درویش بن قاسم اودھی سے یہ سلسلہ خوب پھیلا۔ مولوی ابوالحسن مانکپوری تاریخ آئینۂ اودھ میں رقمطراز ہیں:۔

"ان کی اولاد میں مولوی ابوالحسن صاحب خلف الرشید مولوی بشارت اللہ صاحب ہیں اور علاتی بھائی سید ابوالحسن کے حافظ محمد اسماعیل و محمد خلیل و محمد موسیٰ ہیں مولانا سیدنا مخدوم بڈھن کے طہارت نسب میں کوئی شک نہیں مگر علی الاتصال شجرۂ نسب پدری مولف کو نہ مل سکا اس باعث اس کے لکھنے میں معذوری ہے"

مسالک السالکین فی تذکرۃ الواصلین میں ہے کہ ان کی وفات ۲۵ رمضان المبارک

[۱] اس کتاب کی گیارہویں فصل خاص مشائخ اجملی کے تذکرہ کے لیے مختص ہے۔

۸۶۴ھ (سلطان بہلول لودی کے عہد میں) ہوئی۔ مزار پرانوار شہر بہرائچ میں بستی سے اوتر قریب مزار حضرت مولوی شاہ نعیم اللہ قدس سرہٗ شکستہ اور سڑک کے کنارے واقع ہے۔

اب بہرائچ سے گونڈہ جانے والی سڑک پر دو کیلومیٹر کے بعد سیٹھ بہاری لال کی کوٹھی کے بالکل سامنے سڑک کے اتر جانب ان کا مزار واقع ہے جو ایک چہار دیواری کے اندر ۱½ فٹ اونچے چبوترے پر کھجور کے درخت کے نیچے ہے۔ ۱۹۵۵ء میں راقم الحروف اول بار مزار پر فاتحہ خوانی کے لیے حاضر ہوا تھا۔

اب ان کی اولاد میں حضرت شاہ نعیم اللہ بہرائچیؒ کے گھرانے کے ذریعہ سلسلۂ رشد و ہدایت قائم ہے۔ مسالک السالکین سے ذیل کا قطعۂ تاریخ نقل کیا جاتا ہے۔

شاہ اجمل ولی پاک خدا — عطر اللہ قبرہٗ ابداً
چون بخلد برین سفر فرمود — بست و پنجم ز ماہ رمضان بود
سال نقلش خرد چو گوہر سفت — شد ولی جہاں بخت گفت
باز ترحیل آں چہ خوب و خنک — رحمۃ اللہ علیہ گفت ملک
باز نقلش بہ اختلاف سند — شیخ اہل کمال گفت خرد
۸۶۴

(باقی)

اخبارِ علمیہ

بابری مسجد کا قضیہ ملک کی سیاست میں ہلچل اور اضطراب کا باعث ہونے کے ساتھ ہندوستان کے علمی اور تاریخی حلقوں میں بھی بحث و نظر کا موضوع بنا ہوا ہے، اس کے تجزیے اور جائزے کا سلسلہ لامتناہی ہوتا جا رہا ہے، متعدد مقالات و مضامین اور رسائل و کتب میں بھی اس پر مسلسل اظہار خیال ہو رہا ہے، اس فہرست میں نیا اضافہ بار کاونسل آف انڈیا ٹرسٹ کی کتاب 'رام جنم بھومی بابری مسجد' تاریخی دستاویزات، قانونی آرا اور فیصلے ہے انگریزی زبان میں اسے ونے چندر مصرا نے مرتب کیا ہے، انھوں نے قضیہ کے دونوں پہلوؤں کے متعلق بعض اہم تحریریں جمع کر دی ہیں الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے ریڈر سوشیل سریواستو نے رام جنم بھومی کے مسمار کیے جانے کے دعویٰ کو افسانہ محض قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ہندوستان کے کسی قدیم مورخ اور سیاح نے رام جنم بھومی کا ذکر نہیں کیا حتیٰ کہ ابوالفضل اور ابن بطوطہ جنھوں نے ہندوستان کے متعلق جزئیات تک کو اہتمام سے بیان کیا ہے، ایسے اہم تاریخی اور مقدس مقام کے بارے میں خاموش ہیں، فیض آباد کے ۱۸۲۰ء سے ۱۸۱۹ء تک کے واقعات کو محمد فیض بخش نے مفصل بیان کیا ہے۔ لیکن ان میں بھی ایسے کسی مندر کی بات نہیں، خود تلسی داس، رام جنم بھومی

کے وجود و وقوع سے بے خبر ہیں، وشو ہندو پریشد کی جانب سے حکومت ہند کو جو کاغذات پیش کیے گئے تھے وہ بھی اس کتاب میں شامل ہیں، دو اور مقالہ نگاروں بی، آر گروور سابق ڈائریکٹر انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ اور ایس، پی گپتا سابق ڈائریکٹر الٰہ آباد میوزیم کے مقالات حیرت انگیز طور پر وشو ہندو پریشد کے کاغذات کی نقل ہیں، لیکن ٹائمز آف انڈیا کی نظر میں یہ اتفاق 'غیر متوقع نہیں' ہے، حالیہ برسوں میں اس قضیہ کے متعلق جو اہم اور قابل ذکر تحریریں، دستاویزیں اور عدالت کے فیصلے ہوئے ہیں ان سب کا یہ کتاب مجموعہ ہے جو اس کی بڑی خوبی ہے۔

حقایق بالآخر ظاہر ہو کر رہتے ہیں، ذرہ ذرہ میں ذوق آشکارائی، فطرت کا خاصہ ہے چنانچہ علم حفریات اور آثار قدیمہ کی نئی دریافت کے مطابق مصر، ہند، چین اور عراق و عرب دنیا کی قدیم ترین مہذب و متمدن اقوام میں شامل ہونے کے حقدار ہوئے، اب شکاگو کے فیلڈ میوزیم کے ماہرین آثار قدیمہ نے دعویٰ کیا ہے کہ انھوں نے دریائے آمیزون کی وادی میں ایک ایسی تہذیب کا سراغ پالیا ہے جو میکسیکو، پیرو اور مایا تہذیبوں سے ہزاروں سال پہلے اپنے عروج پر تھی، دریائے آمیزون میں مچھلی اور صدف کی غیر معمولی فراوانی اس تہذیب کے عروج کی بنیاد تھی، وادئ آمیزون کے موجودہ نہایت گھنے جنگلوں کی تاریکیوں میں ایسے قدیم نقوش محفوظ رہے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وادی سے نہ جانے کتنے کارواں گذرے ہوں گے۔

وادی کی مٹی وادی سندھ و نیل کی مٹی سے مشابہ ہے جو کثیر آبادی اور اجتماعی
معاشرت کی تکوین و تشکیل کا باعث بنی، یہاں ایسے منقش گلی ظروف بھی
پائے گئے ہیں جو اس تہذیب کی داستان سنانے کے علاوہ اس کی تاریخی توقیت
یعنی تقریباً آٹھ ہزار برس پہلے کا تعین بھی کرتے ہیں، دنیا کے اس سب سے
بڑے دریا کی گزرگاہ کے اردگرد موہن جوڈارو جیسی بستیوں کا امکان،
ماہرین کے ذوق تجسس کیلئے مہمیز کا کام کر رہا ہے۔

سرزمین مصر بھی آثار قدیمہ کے شیدائیوں کا پسندیدہ آماجگاہ ہے،
گذشتہ دنوں دریائے نیل سے چند میل کے فاصلہ پر چند بڑی کشتیاں
برآمد ہوئیں۔ قاہرہ کے جنوب میں ایک مقام پر بارہ بڑی چوبی کشتیاں
۱۶ سے ۲۰ میٹر تک لمبی دریافت ہوئیں جو تقریباً پانچ ہزار سال پرانی ہیں، قاہرہ
کے روزنامہ 'الاخبار' میں ان کشتیوں کو مصر کی قدیم ترین شاہی کشتیوں کا ایک
حصہ بتایا گیا ہے، ماہرین کی نظر میں قدامت کے علاوہ تاریخ مصر کے فرعون اول کی غیر معلوم
تاریخ کے سراغ ملنے میں بھی یہ بڑی مفید ثابت ہوں گی۔

مصر کے ایک قدیم دارالسلطنت اواریس AVARIS کی کھدائی کے دوران محکمہ
آثار قدیمہ کو یہاں ۳۷۰۰ سال پہلے یونانی تہذیب کے اثرات و باقیات کے شواہد ملے ہیں،
ایک پختہ اور عالی شان قلعہ دریافت ہوا ہے جس میں دیواری تصویروں کے ایک عظیم الشان
سلسلہ کے بعض اجزاء بھی ملے ہیں، جو جزیرہ کریٹ کی مینوان پینٹنگس سے حیرت انگیز

طور پر مشابہ ہیں، یہ جزیرہ مصر سے تقریباً ۵۰۰ کیلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے اور اس کے
پایہ تخت ہونے کی صورت میں مورخین کا خیال ہے کہ مصر کا حکمراں ہیکساس تھا
جس کے معنی 'بیرونی شہزادہ' کے ہیں، اب تک یہ خیال عام تھا کہ بیرونی
شہزادوں سے مراد موجودہ اسرائیل اور لبنان کے باشندے ہیں، لیکن اس
جدید تحقیق سے انجیل کی بعض روایات مشتبہ ہو جاتی ہیں، بعض محققین کی رائے میں جب
ہیکساس مصر کا حکمراں تھا تو حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کے صاحبزادگان
مصر میں متوطن تھے اور یہ خروج بنی اسرائیل سے بہت پہلے کی بات ہے، بہرحال
اس نئی کھدائی کے نتیجہ میں اس عہد کی تاریخ پر از سر نو نظر ڈالنے کی ضرورت محسوس
کی جا رہی ہے۔

ایک دلچسپ خبر یہ بھی ہے کہ آسٹریا میں کوہ آلپس کی ایک برفیلی چوٹی پر ایک
برفانی آدمی کی ممیائی ہوئی لاش ملی، یہ چمڑے کے لباس میں ہے ساتھ میں ایک چاقو
بھی ہے، سائنسدانوں نے پہلے تو تقریباً چار ہزار سال قدیم بتاتے ہوئے اسے عہد برونز
عہد کی ایک نادر دریافت سے تعبیر کیا لیکن اب اس جثہ کو سائنسدانوں کے خیال سے کہیں
زیادہ قدیم تصور کیا جا رہا ہے، اس برفانی لاش کے چاقو کی دھار تانبہ کی ہے جو برونز
عہد سے بھی قدیم زمانہ کی نشاندہی کرتی ہے۔

عہد رفتہ کے مدفون و مستور خزینوں کی بازیافت کی ایک خبر یہ ہے کہ ہندوستان کے
صوبہ اروناچل پردیش میں ایک چار سو سالہ قدیم بودھ صومعہ سے تقریباً ۹۰۰ کتبات اور مخطوطات

کا ذخیرہ برآمد ہوا ہے، یہ زیادہ تر مہایانہ بدھ مت کے ملفوظات ہیں اور تبتی زبان و رسم الخط میں ہیں خانقاہ میں اٹھارویں صدی میں ایک کتبخانہ قائم کیا گیا تھا جو اب بالکل منتشر اور پراگندہ ہے۔ یہ خزانہ اسی کے غبار میں مستور تھا۔

ایک جانب زمین اپنے بعض رازہائے سربستہ کو مسلسل درس عبرت بنا کر پیش کر رہی ہے تو دوسری طرف خلائے بسیط، علم اشیاء کے وارثوں کو علم و حیرت کی نئی جہات سے روشناس کرتی جاتی ہے، حال ہی میں برطانیہ کے سائنسی مجلہ SPECTRUM نے اطلاع دی ہے کہ مانچسٹر یونیورسٹی کے پروفیسر اینڈریو لین نے اپنے بعض ساتھیوں کے ساتھ جارڈل بینک کی ۷۶ میٹر ریڈیو دوربین سے نظام شمسی سے پرے ایک ایسے سیارہ کا مشاہدہ کیا جو اپنی نوعیت میں منفرد اور اولین ہے، یہ سیارہ لاکھوں کیلومیٹر کے فاصلہ پر جس طرح کبھی دور اور کبھی قریب ہوتا ہے اس سے اس کے ساتھی کسی اور سیارہ کے وجود کا بھی پتہ چلتا ہے جو ہماری زمین سے تقریباً دس گنا زیادہ بڑا ہے، یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ متحرک اور رواں سیارے جسامت میں ہمارے سورج سے کہیں زیادہ بڑے تھے لیکن بعد میں وہ نیوٹرون ستاروں سے متصادم ہوگئے، ان کے اندر نہایت طاقتور مقناطیسی زمین ہے فضائے بسیط میں یہ نور کی چادر یا خوشہ نور کی مانند مسلسل گردش میں رہتے ہیں اور جب یہ زمین کے رخ پر ہوتے ہیں اسوقت ریڈیو ٹیلسکوپ انکی لہروں کے ارتعاش کو محسوس کر لیتا ہے، اس نئے سیارے کے متعلق یہ کہنا مشکل ہے کہ اس میں زندگی کا وجود ہے یا نہیں، لیکن یہ امید ضرور ہے کہ انکے علاوہ اور بھی سیاروں کا وجود ممکن ہے جو شاید حیات انسانی کیلئے موزوں اور سازگار ہوں۔

ع۔ ص ا۔

وفیات

ڈاکٹر عبد المنعم النمر

از مولانا قاضی اطہر مبارکپوری

اس دور میں مصر کے دو ازہری عالموں نے ہندوستان کی اسلامی تاریخ اور یہاں کی علمی و دینی خدمات و شخصیات سے خصوصی اعتنا کیا ہے اور اس موضوع کے بارے میں عالم عرب اور عالم اسلام کے لیے بیش بہا معلومات فراہم کیں، ایک سابق وزیر اوقاف مصر ڈاکٹر عبد المنعم النمر رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے مدیر کلیہ شیخ الازہر ڈاکٹر عبد العزیز عزت حفظہ اللہ وسلمہ، اس وقت شیخ عبد المنعم النمر کا ذکر مقصود ہے جنھوں نے ۲۷ ماہ ہندوستان میں رہ کر عربی زبان و ادب اور ثقافت کی تعلیم دینے کے ساتھ کشمیر سے مالابار تک سیاحت کر کے یہاں کے اسلامی آثار و تواریخ کا بغور مطالعہ کیا اور کتابیں لکھیں، نیز مولانا ابو الکلام آزاد پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور استاذ عبد العزیز عزت نے یہاں کی متعدد کتابوں کا عربی میں ترجمہ شایع کیا، یہ دونوں عالم جامع ازہر اور موتمر اسلامی کی طرف سے ہندوستان میں مبعوث تھے، شیخ النمر کے ذکر سے پہلے استاذ عزت کا مختصر تعارف مناسب معلوم ہوتا ہے۔

استاد عبد العزیز عزت نے جامع ازہر میں تعلیم حاصل کی اور اسی میں اردو زبان سیکھی اردو کی کتابیں اور اخبارات و رسائل بے تکلف پڑھتے اور سمجھتے ہیں البتہ بات چیت میں عربی اردو بولتے ہیں جس طرح یہاں کے علماء عربی کتابیں پڑھتے پڑھاتے ہیں اور گفتگو میں ہندی عربی بولتے ہیں اور دونوں کے لیے یہ عیب کی بات نہیں ہے بلکہ اس سے سننے والے

اہل زبان کو لطف آتا ہے، وہ جامع ازہر اور موتمر اسلامی کی طرف سے بمبئی میں عربی زبان کی تعلیم کے لیے مبعوث ہوئے اور تقریباً چار سال کے بعد ۱۹۶۵ء میں واپس ہوئے، اس درمیان میں میرے ان کے تعلقات عزیزانہ انداز کے ہوگئے، اس کے بعد وہ پاکستان میں مبعوث ہوئے اور مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سیرۃ النبیؐ جلد سوم پر تحقیقی مقالہ لکھکر کراچی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، نیز سید صاحب مرحوم کی کتاب "عربوں کی جہاز رانی" کا عربی میں ترجمہ الملاحۃ عند العرب کے نام سے شایع کیا جس کا مقدمہ پاکستان میں مصر کے سفیر سید علی ابوالفضل خشبہ نے لکھا ہے، موصوف نے مصر میں ایک ملاقات میں بتایا کہ اس کا مسودہ اسکندریہ یونیورسٹی کے استاذ بحریات نے مطالعہ کے لیے طلب کیا اور تقاضا کے باوجود واپس نہیں کیا مگر بعد میں کسی طرح اس کو حاصل کرکے شایع کیا، موصوف نے میری کتاب "عرب و ہند عہد رسالت میں" کا ترجمہ "العرب والهند فی عهد الرسالة" کے نام سے کرکے ۱۹۷۳ء میں قاہرہ کی الهيئة المصرية العامة للكتاب سے شایع کیا، اور "ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں" کا ترجمہ "الحكومات العربية فی الهند والسند" کے نام سے مکتبہ آل مداللہ البکریہ ریاض سے شایع کیا، وہ فی الحال مجمع البحوث الاسلامیہ کے رکن رکین اور مدیر مکتبہ شیخ الازہر ہیں،

شیخ عبدالمنعم النمر اگست ۱۹۱۳ء میں مصر کے مشہور شہر دسوق میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم مقامی درسگاہ میں حاصل کرکے جامع ازہر میں داخل ہوئے اور ۱۹۳۹ء میں کلیۃ اصول الدین سے عالمیت کی سند پائی، پھر وہیں سے ۱۹۴۱ء میں ماہر تعلیم کی سند حاصل کرکے جامع ازہر اور مصر کے دیگر معاہد و جامعات میں تعلیمی خدمت انجام دی، ۱۹۵۶ء میں جامع ازہر اور موتمر اسلامی نے ان کو دارالعلوم دیوبند بھیجا جہاں انھوں نے

۲ ماہ رہ کر عربی ادب و ثقافت کی تعلیم دی اور ہندوستان کی سیاحت کرکے یہاں کی اسلامی تاریخ و آثار کے متعلق معلومات جمع کیں، ان کے ساتھ شیخ عبدالعال العقبادی بھی استاد و معلم کی حیثیت سے تھے، ۱۹۶۵ء میں کویت کے مجلہ الوعی الاسلامی کے رئیس التحریر ہوئے، اور مختلف علمی و فقہی موضوعات پر پُر مغز مضامین و مقالات لکھے، اسی دوران امارت عربیہ متحدہ سے مجلہ المنار جاری کیا، ۱۹۷۵ء میں جامع ازہر کے وکیل بنائے گئے اور مدیر البعثات الازہریہ کی حیثیت سے مفوضہ خدمات بوجوہ احسن انجام دیں، ۱۹۷۹ء میں وزیر اوقاف بنائے گئے اور ۱۹۸۶ء میں حکومت مصر کی طرف سے ان کی علمی، تحقیقی اور دوسری مختلف خدمات کے اعتراف کے طور پر توصیفی سند پیش کی گئی اور مئی ۱۹۹۱ء (اواخر ذو قعدہ ۱۴۱۱ھ) میں قاہرہ میں انتقال کیا، رحمۃ اللہ علیہ۔

شیخ عبدالمنعم النمر کی شخصیت بڑی طرحدار تھی، وہ قدیم و جدید کے جامع اور متوازن ذہن و مزاج کے عالم تھے، علمی و تحقیقی اور تعلیمی و تصنیفی مشاغل کے ساتھ عالم اسلام کے مسائل و معاملات سے عملی تعلق رکھتے تھے، اسلامی و سیاسی موتمرات میں اپنی باوزن شخصیت اور صائب رائے کے ساتھ حصہ لیتے تھے، بہترین خطیب تھے، اپنی مختلف الجہات صلاحیت کی وجہ سے دینی و علمی اور سیاسی حلقوں میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور اپنے اخلاق کریمانہ کی وجہ سے ہر طبقہ میں مقبول تھے، ایک موقع پر ان کے شیخ الازہر ہو جانے کا امکان پیدا ہو رہا تھا، راقم کی ان سے پہلی ملاقات اکتوبر ۱۹۵۶ء میں جمعیۃ علمائے ہند کے اجلاس سورت میں ہوئی، اسی سال وہ دارالعلوم دیوبند تشریف لائے تھے، ہندوستان کی اسلامی تاریخ ان کی طرح میرا بھی خاص موضوع تھا، اس لیے دونوں میں اچھا خاصا تعارف و تعلق ہوگیا، بعد میں مکہ مکرمہ کے

مجلہ الحج میں انھوں نے المسلمون فی الہند کے عنوان سے مقالات لکھے جس میں بعض
باتیں میرے حوالے سے نقل کیں اور تقریباً دو ہفتہ تک ان سے تفصیلی ملاقات ۱۹۵۶ء
میں بمبئی میں ہوتی رہی جب کہ وہ واپس جا رہے تھے، پہلی بار میرے کمرے میں آئے،
اور اندر قدم رکھا تو بے ساختہ کہا یا سلام تاھلت بالکتب والکتابۃ، اس وقت
چٹائی پر کتابیں اور اخبارات بکھرے ہوئے پڑے تھے، ان کا یہ جملہ میرے لیے سند کی
حیثیت رکھتا ہے، اس وقت رجال السند والہند مطبعہ حجازیہ بمبئی میں چھپ رہی تھی،
اس پر اپنی رائے لکھی اور مطبوعہ فرمے اپنے ساتھ لیتے گئے۔ اس کے بعد وہ تین بار بمبئی،
دیوبند اور دہلی تشریف لائے اور اتفاق سے ہر بار ان سے ملاقات ہوتی رہی اور سب سے
زیادہ ملنا جلنا قاہرہ میں ۱۹۷۸ء میں ہوا جب وہ مدیر البعثات الازہریہ تھے،
اور میں عرب و افریقہ کے علمی سفر میں تھا۔

جس زمانہ میں ڈاکٹر صاحب الوعی الاسلامی کویت کے رئیس التحریر تھے، ایک
لکھے پڑھے آدمی کو جو بمبئی آرہا تھا، مجھ سے ملاقات کرنے اور سلام پہنچانے کی تاکید کی تھی'
وہ صاحب عشاء کے وقت میرے کمرے میں آئے مغربی لباس میں تھے، حسب معمول
کمرے میں چٹائی اور چادر بچھی ہوئی تھی وہ کھڑے رہے، میں نے تشریف رکھنے کو کہا،
انھوں نے کہا کہ میں تاج محل ہوٹل کے فلاں کمرے میں ہوں، آپ وہیں آجائیں، یہ
کہکر وہ چلے گئے اور میں نہیں گیا، موجودہ دور کے مصر و عرب کے فضلا و مشائخ سمجھ
نہیں سکتے کہ ہندوستان کے بوریہ نشین علما کس طرح دینی و علمی خدمت کرتے ہیں، انھوں نے
ہندوستان سے واپس جاکر قاہرہ میں ہندوستان کے متعلق تین کتابیں تصنیف کیں
(۱) تاریخ الاسلام فی الہند (۲) کفاح المسلمین فی تحریر الہند (۳) سبعۃ و عشرون شہرا فی الہند

اور مولانا ابو الکلام آزاد پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی، تاریخ الاسلام
فی الہند ۱۳۷۸ھ (۱۹۵۹ء) میں شایع ہوئی اور ۲۱ اپریل ۱۹۶۰ء کو موصوف نے
میرے پاس بھیجا، اس کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ جب جامع ازہر اور موتمر اسلامی نے مجھے
ہندوستان بھیجنے کا ارادہ کیا تو میں بڑی کشمکش میں پڑ گیا کیونکہ اس ملک کے بارے
میں اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس کو محمد بن قاسم ثقفی اور سلطان محمود غزنوی
نے فتح کیا ہے اور یہاں کے لوگ ہاتھی پر سواری کرتے ہیں، اسی وجہ سے یہاں کی
اسلامی تاریخ کی تلاش و تحقیق کا خیال پیدا ہوا اور یہاں آکر تدریس و تعلیم کی مشغولیت میں
کشمیر سے مالابار تک مختلف تقریبوں سے سفر کیے اور ہر جگہ مختلف ذرایع سے
معلومات حاصل کی۔

مرحوم نے تاریخ الاسلام فی الہند کے ساتھ جو خط مجھے لکھا اس سے ان کی اسلامی ہند
کی تاریخ سے گہری دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے، لکھتے ہیں کہ میں آپ کے پاس یہ کتاب بھیج
رہا ہوں، مجھے امید ہے کہ اس میں آپ کے لیے خوش کن باتیں ہوں گی، نیز یہ کہ آپ مجھے
اس کتاب کے بارے میں اپنی رائے لکھیں گے اور جو کمی ہو اس کی نشان دہی کریں گے،
تاکہ طبع ثانی میں اس سے استفادہ کروں، مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کی کتاب رجال السند
والہند کی پہلی جلد شایع ہو چکی ہے، مجھے ایک نسخہ بھیج دیں اس طرح میں ہندوستان کے
مسلمانوں کے بارے میں ایک کتاب لکھ چکا ہوں جس میں ہندوستان کی تحریک آزادی
سے قیام پاکستان تک مسلمانوں کی جدوجہد کی تفصیل بیان کی ہے اِس موضوع کے
بارے میں اگر کوئی خاص بات معلوم ہو تو لکھیں تاکہ اس سے مدد لوں، اس سال
(۱۹۶۰ء) قاہرہ کے ہندوستانی سفارت خانہ نے صوت الہند کے نام سے جریدہ

شایع کیا ہے میں نے اس میں ایک طویل مقالہ "النشاط العلمی والاجتماعی للمسلمین فی الھند" کے عنوان سے تحریر کیا ہے اور انجمن خدام النبی ممبئی اور اسکے ارکان کے بیان پر ختم کیا۔ یہ جریدہ عالم عربی میں تقسیم کیا گیا ہے، موسم حج کی مناسبت سے شایع کیا گیا ہے، اور حجاز میں بھی تقسیم کیا جائے گا۔

میری کتاب مترجمہ ڈاکٹر عبدالعزیز عزت الحکومات العربیۃ فی الھند و السند پر ڈاکٹر عبدالمنعم النمر مرحوم نے ۱۸ اگست ۱۹۸۰ء کو نہایت شاندار مقدمہ لکھا ہے، مرحوم سے میری آخری ملاقات گذشتہ سال دہلی میں ہوئی تھی جب کہ وہ سرکاری مہمان کی حیثیت سے مولانا ابوالکلام آزاد صدی تقریبات میں آئے تھے، ان کی طلب پر میں نے العقد الثمین فی فتوح الھند پیش کی اور کہا کہ آپ اب بوڑھے ہوگئے ہیں انھوں نے اس کے جواب میں کہا وانت ایضاً،

یادِ رفتگاں

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے وفیات کے تحت یا شذرات میں اپنے دور کے جن مشاہیر اور ممتاز اہل علم و قلم کے بارے میں اپنے تاثرات تحریر کیے تھے یہ کتاب انکا مجموعہ ہے اس میں اپنے اساتذہ، شیخ طریقت احباب و معاصرین اور مختلف طبقوں کے لوگوں کا دلچسپ اور پُر از معلومات تذکرہ کیا ہے اور مسلمانوں کے علاوہ بعض ہندوؤں، عیسائیوں اور یہودیوں کا بھی ذکر ہے قیمت ۵۰ روپیے

بزمِ رفتگاں

یہ کتاب جناب سید صباح الدین عبدالرحمنؒ کے قلم سے دو حصوں پر مشتمل ہے اس میں انھوں نے اپنے عہد کے مختلف طبقے کے اصحاب علم و ادب اور قومی و ملی زندگی سے تعلق رکھنے والے مختلف افراد کے بارے میں اپنے تاثرات و مشاہدات قلم بند کیے ہیں، اسکا پہلا حصہ مکتبہ جامعہ دہلی نے شایع کیا ہے اور دوسرا دارالمصنفین سے چھپا ہے۔ حصہ دوم قیمت ۳۵ روپیے

"منیجر"

مطبوعاتِ جدیدہ

GABRIEL'S WING از ڈاکٹر انا میری شمل، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت مجلد مع گرد پوش، صفحات ۴۰۸، قیمت ۱۵۰ روپیے پتہ: اقبال اکاڈمی لاہور پاکستان۔

علامہ اقبال کے کلام و پیام کے شیدائیوں اور شارحین میں جرمنی کی ڈاکٹر انا میری شمل بھی ہیں جو اپنے بلند پایہ مقالات اور کتابوں کی وجہ سے محتاج تعارف نہیں، زیر نظر کتاب علامہ اقبال کے پچیسویں سال وفات کے موقع پر شایع ہوئی تھی پچیس برس گزرنے کے بعد اب اس کا یہ دوسرا اور جدید ایڈیشن شایع ہوا ہے، اس میں شاعر مشرق کے مذہبی نظریات کا جامع جائزہ تین ابواب میں لیا گیا ہے اور اسلام کے پانچ بنیادی ارکان اور جہاد کے علاوہ انبیاء علیہم السلام، کتب آسمانی، روز آخرت، قضا و قدر اور خیر و شر کے متعلق جس عالمانہ انداز سے بحث کی گئی ہے اس سے مصنف کی وسعت مطالعہ اور اصابت رائے کا اندازہ ہوتا ہے علامہ اقبال علمی و دینی معاملات میں مولانا سید سلیمان ندویؒ سے برابر رجوع کیا کرتے تھے، مصنفہ نے اس سلسلہ میں سید صاحبؒ اور علامہ کی مراسلت کا ذکر کرکے صحیح اور مثبت نتائج اخذ کیے ہیں، ان کی نظر میں یہ مراسلت، حیات اقبال کے نظریاتی باب کا جاذب ترین حصہ ہے، پہلے باب میں علامہ کے سوانح، خاندانی پس منظر، مذہبی محرکات کے علاوہ ان کے کلام کے جمالیاتی پہلو پر بھی مفید گفتگو کی گئی ہے مستشرقین

سے تعلق کی بحث بھی پر مغز ہے خود مصنف نے اسے خصوصی مطالعہ کا مستحق قرار دیا ہے، انھوں نے جرمنی کے عصر حاضر کے نامور فلسفی رڈولف پان وٹنز کے حوالہ سے یہ ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ اسلامی افکار پر مشتمل ہونے کے باوجود فلسفہ اقبال، غیر مسلموں کے لیے بھی پرکشش ہے، کتاب کے مراجع اور فہرست کتب سے بھی مصنف کی محنت کا اندازہ ہوتا ہے، آخر میں سلیقہ سے اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔ پچیس برس گزرنے کے بعد بھی کتاب کی تازگی باقی ہے

AKBAR AND RELIGION از پروفیسر خلیق احمد نظامی،

متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش صفحات ۴۷۰ قیمت ۳۵۰ روپیے۔

پتہ: ادارۂ ادبیات دلی ۲۰۰۹، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۱۱۰۰۰۶۔

مغل حکمراں جلال الدین محمد اکبر کی زندگی کے مختلف مدارج میں مذہبی افکار کے بوقلموں مظاہر، مورخین کے لیے متنازعہ اور مختلف فیہ مباحث رہے ہیں اور ان میں افراط و تفریط کے عنصر کی کارفرمائی واضح طور پر نظر آتی ہے، بعض مورخین نے اسے ملحد و مرتد ثابت کرنے کی کوشش کی تو بعض نے اس کی غیر معمولی ذہانت اور جویائے حق طبیعت کے سیاق میں بدعقیدہ ظاہر کرنے پر اکتفا کیا، زیر نظر کتاب کے تین حصوں میں اکبر کی پرکشش شخصیت، خاندانی اثرات، تعلیم، علم و دانش، معاصر مذہبی تحریکوں اور رجحانات، علماء و صوفیہ، ہندوستانی سیاست کا مزاج و روایات اور مذہب کے متعلق اکبر کی کشمکش اور اس کے خیالات اور ان کے رد و قبول پر مفصل بحث کی گئی ہے، فاضل مولف کے نزدیک اسلام کے بارہ میں اکبر کا پہلا دور ہمدردی، دوسرا بے حسی اور تیسرا نفرت و بیزاری کا ہے، انھوں نے اس سلسلہ میں عہد اکبری کے تمام اہم اسباب

محرکات کا مورخانہ نقطہ نظر سے جائزہ لیا، ان کے خیال میں اکبر کے مذہبی رویہ کی صحیح علمی توجیہ صرف تاریخ کے جھروکوں سے ہی کی جاسکتی ہے۔ اس کے درباریوں اور اس کے عہد کے مورخوں کے نفسیاتی جائزہ کے علاوہ ہندومت، نصرانیت اور مجوسیت سے اس کے تعلق کو ہندوستان کی سیاست کے پس منظر میں دیکھا گیا ہے، اس قابل قدر کتاب کی تدوین میں انھوں نے ہندوستان کے علاوہ برطانیہ، اٹلی اور ایران کے علمی ذخیروں سے بھی خوشہ چینی کی ہے جس سے اس بحث میں جدت و ندرت کا رنگ پیدا ہوگیا ہے۔ آخر میں چند ضمیموں میں بعض تاریخی دستاویز، محضر، اکبر کے خطوط، سکوں، عمارتوں اور تصویروں کے علاوہ اہم حالات کو بلحاظ سنین درج کر دیا گیا ہے اور کتابیات اور اشاریہ اس پر مستزاد ہے۔

SOCIO ECONOMIC DIMENSION OF FIQH LITERATURE IN MEDIEVAL INDIA

از ڈاکٹر ظفر الاسلام، تقطیع متوسط، کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۵۰،

قیمت ۹۰ روپے، ناشر: ریسرچ سیل، دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، نسبت روڈ لاہور پاکستان

قرون وسطیٰ کے ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومتوں کے استحکام اور ان کے معاشرہ کے قیام کے بعد یہاں کے مختلف مذاہب اور ان کی تہذیب و معاشرت کی موجودگی کی بنا پر اسلامی قانون و فقہ کو نئے مسائل و حوادث کا سامنا کرنا پڑا جن سے عہدہ برآ ہونا ناگزیر امر تھا، چنانچہ محصول آراضی، زمین کی ملکیت، زراعتی قوانین، زکوٰۃ کا مصرف، مسلم و غیر مسلم تعلقات کی نوعیت وغیرہ کے بارے میں عہد سلطنت اور مغلیہ دور کے سیاسی و تمدنی تاریخ میں فقہاء کے اقوال و آراء متفرق طور پر جابجا ملتے ہیں، زیر نظر

کتاب میں لائق مصنف نے عہد سلطنت میں فقہ اسلامی کے ارتقا اور فتاوی فیروز شاہی کی روشنی میں اس عہد کے سیاسی و معاشرتی مسائل اور مسلم و غیر مسلم تعلقات کا جائزہ لیا ہے اور فتاوی عالمگیری کی روشنی میں محصول آراضی اور اسکے متعلق اورنگزیب کے فرمان پر بھی بحث کی ہے، انکے علاوہ سولھویں صدی کے زرعی قوانین کے متعلق شیخ جلال الدین تھانیسری کے رسالہ در بیع آراضی اور مغل دور حکومت میں جائداد کے متعلق اٹھارویں صدی کے قاضی محمد اعلا تھانوی کے رسالہ احکام الآراضی پر بھی مضامین ہیں۔ لائق مولف نے فقہ جدید کی تدوین اور جدید مسائل کے حل کے لیے سلاطین کی علم پروری اور حوصلہ افزائی کا خاص طور سے ذکر کیا ہے، ان فتاوی سے بعض دلچسپ سیاسی و سماجی نتائج اخذ کیے گئے ہیں مثلاً دولت آباد کے رویت ہلال کو دلی میں تسلیم کیا جانا گو یہ ایک خالص فقہی مسئلہ ہے لیکن اس سے ہندوستان کے شمال و جنوب کے درمیان ربط و یکجہتی کا پتہ چلتا ہے، اسی طرح دلی اور ہندوستان کے دوسرے شہروں میں آباد ہونے والے مسلم مہاجرین کے آبائی وطن کو اصلی وطن کی قانونی حیثیت سے کالعدم قرار دیے جانے سے ہندوستان میں مسلم معاشرے کی آبادکاری کے منصوبہ پر روشنی پڑتی ہے، سکندر لودی کے عہد میں کورکشیتر کے ایک کنڈ کے متعلق علما نے فتوی دیا کہ کسی بھی عبادت گاہ کو منہدم کرنا جائز نہیں، اسی طرح مسلم و غیر مسلم تعلقات کی نوعیت پر فتاوی فیروز شاہی میں جو سوال و جواب مذکور ہیں، انکی عمدہ ترجمانی کی گئی ہے۔ لائق مصنف مسلم یونیورسٹی کے شعبہ علوم اسلامی کے نوجوان اور لائق استاد ہیں، ملک و بیرون ملک کے ممتاز علمی مجلسوں میں ان کے مقالات شایع ہوکر اہل علم و نظر کی توجہ کا مرکز بن چکے ہیں، ان کی یہ کتاب مفید اور قابل قدر ہے، اس کی اشاعت پر اس کے ناشر مولانا عبد المتین ہاشمی بھی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ع۔ص۔